فلسطین پر مسلمانوں کے حقِ ملکیت پر مبنی دلائل
اور دیگر اقوامِ عالم کے دعویٰ ملکیت کا رد
ارضِ مقدس
ابو الحسن نعیم

ابو الحسن نعیم

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔ارضِ مقدس

مصنف۔۔۔۔۔۔۔ابو الحسن نعیم

سرورق۔۔۔۔۔۔مولانا محمد اکرام

نظرِ ثانی۔۔۔۔۔۔مولانا محمد انس

فون نمبر۔۔۔03149301015

انتساب

اس عظیم شخصیت کے نام جن کی تربیت، وارفتگی، احساس، شفقت،

راہنمائی، عنایت، قربانی اور لامحدود محبت نے مجھے علم کی راہوں کا مسافر بنایا

یعنی

میری دادی جان کے نام

فہرست

ابتدائیہ

سرزمینِ بیت المقدس ایک مرتبہ پھر خبروں کی زینت ہے۔ وہاں ہونے والے ظلم و جبر کو دنیا دیکھ رہی ہے، اس کی مذمت زور و شور سے ہو رہی ہے، مظلوموں کی آہٹ ہر طرف سنائی دے رہی ہے، دنیا اپنی طرف داری کا فیصلہ کرنے میں مصروف ہے، مسلمان اپنے ہم مذہب بھائیوں کے لیے دعاؤں کا اہتمام کر رہے ہیں اور ان کی مدد و نصرت کے لئے میسر ذرائع کے ساتھ معاونت کے لیے کوشاں ہیں۔

وہیں سرزمین بیت المقدس کی ملکیت کے متعلق فکری جنگ بھی برپا ہے۔ کفار و مستشرقین اور وہ مسلم فلاسفر جو نت نئ تحقیق کی تلاش میں رہتے ہیں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر کے ایسے تصورات کو جنم دے رہے ہیں جو بیت المقدس پر مسلمانوں کے حقِ تولیت کو مشکوک قرار دیں۔ چنانچہ ہم اس کتاب میں بیت المقدس کے فضائل و برکات، تاریخ اور دیگر اہم موضوعات کو زیرِ بحث لائے ہیں تا کہ بیت المقدس کی تولیت کے متعلق صحیح مؤقف واضح ہو سکے۔

فضائل وبرکات

قرآن کریم میں پروردگار نے کس طرح خوبصورت اسلوب میں بیت المقدس کا تذکرہ کیاہے اور سرزمینِ بیت المقدس کی برکات کوواضح کیاہے۔ فرماتے ہیں؛

سُبْحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَی الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (بنی اسرائیل: 1)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی تک لے گئی جس کے ارد گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے

اسی طرح سورۃ الانبیاء میں فرماتے ہیں؛

وَ نَجَّیۡنٰہُ وَ لُوۡطًا اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا لِلۡعٰلَمِیۡنَ۔

ترجمہ: اور ہم ابراہیمؑ اور لوطؑ کو بچا کر اس زمین کی طرف لے چلے جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لئے برکت رکھی تھی۔ (سورۃ الانبیاء: 71)

اسی آیت میں ابراہیمؑ اور لوطؑ دونوں کو ارضِ فلسطین کی طرف ہجرت کا حکم ہوا اور عراق کے بعد شام کے علاقے فلسطین میں یعنی ارضِ بیت المقدس کی

طرف جانے کا حکمنامہ موصول ہوا۔ اسی کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے اس زمین میں سارے جہان کے لیے برکتیں رکھ دی ہیں۔

اسی طرح سورۃ الانبیاء میں ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں؛

وَ لِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ عَاصِفَۃً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِہٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا ؕ وَ کُنَّا بِکُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِیۡنَ۔

ترجمہ: ہم نے تند و تیز ہوا کو سلیمان (علیہ السلام) کے تابع کر دیا جو اس کے فرمان کے مطابق اس زمین کی طرف چلتی تھی جہاں ہم نے برکت دے رکھی تھی، اور ہم ہر چیز سے باخبر ہیں۔ (سورۃ الانبیاء: 81)

یعنی ہم نے سلیمان ؑ کے لیے ہوا کو اس لیے مسخر کیا تاکہ وہ جلدی سفر کر کے اس زمین میں پہنچ جائیں جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔

برکت کا معنٰی:

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں ارضِ بیت المقدس کا جہاں تذکرہ کیا ہے وہیں اس کے بارے میں ذکر فرمایا کہ ہم نے یہاں برکتیں رکھ دی ہیں۔ یہ جو برکت کا ذکر ہوتا ہے یہ برکت کیا ہے اور اس کا معنی و مفہوم کیا ہے؟

عربی لغت میں برکت کا معنی "**خیر و بھلائی میں اضافے**" کو کہتے ہیں لیکن دراصل برکت کہتے ہیں "کنویں کے پھوٹنے کی جگہ جہاں سے پانی مسلسل نکلتا رہتا ہے"

اسی طرح برکت کا لفظ "بارک اللہ فی الشئ، بارک علیہ، بارک لہ" سے مشتق ہے۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ "کسی خیر کے کام میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و اضافے کا نام برکت ہے"۔

ظاہری برکات:

سرزمینِ بیت المقدس کی برکت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جیسا کہ خوبصورت نہریں، لہلہاتی کھیتیاں، آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے درخت، پھلوں سے بھرے ہوئے باغات، قدرت کی مٹھاس سے بھرپور چشمے، ریگزار، پہاڑ اور نشیب و فراز سے سجی ہوئی خوبصورت زمین۔

اس کے علاوہ اس کی سرحدیں دیگر ممالک سے مل کر اس کی اہمیت کو مزید واضح کرتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ شمال سے لبنان، شمال مشرق سے شام، مشرق میں اردن، جنوب کی طرف سے خلیج عقبہ اور مغرب میں بحیرہ روم ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جو صدیوں سے قافلوں کی گزر گاہ رہا ہے۔ 332 قبل مسیح میں سکندر

اعظم نے ارد گرد کے علاقوں پر حملہ آور ہونے کے لیے اسی ارضِ مقدس کا انتخاب کیا۔ سیدنا عمرو بن العاصؓ نے مصر پر حملہ کرنے کے لیے ارضِ بیت المقدس کو گزر گاہ کے طور پر استعمال کیا اور مسلمانوں کے لیے بحیرہ روم بندر گاہ کے طور استعمال ہوتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ فوجی اڈہ بھی تھا۔ آج بھی بحیرہ روم سے یورپ کا راستہ جاتا ہے اور ایشیا سے افریقہ جانے والوں کے لیے ایک دروازے کا کام بھی کرتا ہے۔

علاوہ ازیں ارضِ بیت المقدس انبیاءؑ کی سر زمین ہے۔ اس مبارک علاقے کی طرف متعدد انبیاءؑ مبعوث ہوئے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہروں کا نقطہ آغاز ارضِ مقدس سے ہوا۔

ارضِ مقدس کی ظاہری برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ یہ زمین وسیع نہروں، خوبصورت آبشاروں اور سمندر سے اپنے نور کو نکھارتی ہے۔

علامہ ابنِ کثیر ؒ نے "بٰرکنا حولہ" کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس سے "لہلہاتے کھیت اور پھل مراد" ہیں۔ علامہ ابنِ جوزیؒ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ پروردگار نے یہاں کھیتیوں اور پھلوں کی فراوانی رکھی ہے اور یہ علاقہ انبیاء کرام کا مسکن اور فرشتوں کی قیام گاہ ہے۔ بہت سارے سیاح جنہوں نے

فلسطین کا سفر کیا انہوں نے اپنے سفر ناموں میں لکھا ہے کہ یہ ایسی سرزمین ہے جہاں فصلیں، باغات، پھل اور دیگر نعمتیں وافر ہیں۔ پھلوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا اور ان میں زیتون کا خاص طور پر ذکر کیا کہ زیتون اس مبارک زمین میں بہت زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ایک زرد رنگ کا تربوز بھی بہت مشہور تھا۔

یہ سرزمینِ بیت المقدس کی ظاہری برکات کی ایک جھلک ہے۔ اگر ہم اس کی ظاہری جمالیات کی تفصیلات بیان کرنا شروع کر دیں تو ہمارے مضمون کا موضوع تبدیل ہو جائے گا جبکہ اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ لہذا ان چند اشاروں میں ہی اپنے موضوع کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں

معنوی برکات:

ارضِ مقدس کی معنوی برکات کی چند صورتیں بنتی ہیں:

1۔ انبیاءؑ کا مسکن

2۔ فرشتوں کی قیام گاہ

3۔ محلِ انصاف

1. انبیاءؑ کا مسکن

ارضِ فلسطین اور خاص طور پر بیت المقدس میں کئی انبیاءؑ پر وحی نازل ہوئی اور قرآن کریم نے ان کا تذکرہ کیا۔ کئی انبیاءؑ ایسے ہیں جنہیں ارضِ مقدس کی طرف ہجرت کا حکم ہوا اور کچھ انبیاءؑ وہیں پیدا ہوئے اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

سورۃ العنکبوت آیت نمبر 26 میں ہے؛

فَاٰمَنَ لَہٗ لُوۡطٌ ۘ وَ قَالَ اِنِّیۡ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ.

ترجمہ: پس حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر حضرت لوط (علیہ السلام) ایمان لائے اور ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں وہ بڑا ہی غالب اور حکیم ہے۔

قتادہؒ فرماتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے کوفہ سے شام کی طرف ہجرت کی تھی جبکہ ارضِ مقدس شام کا علاقہ ہے۔

اسی طرح سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں؛

وَ نَجَّیۡنٰہُ وَ لُوۡطًا اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا لِلۡعٰلَمِیۡنَ۔

ترجمہ: اور ہم ابراہیم اور لوط کو بچا کر اس زمین کی طرف لے چلے جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لئے برکت رکھی تھی۔(سورۃ الانبیاء:71)

یعنی ہم نے ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے لوطؑ کو نجات دی، وہ شام کے علاقے میں ہجرت کر کے تشریف لے گئے۔

اسی طرح سورۃ الاعراف آیت نمبر 138 میں ہے؛

وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتَوۡا عَلٰی قَوۡمٍ یَّعۡکُفُوۡنَ عَلٰۤی اَصۡنَامٍ لَّہُمۡ ۚ قَالُوۡا یٰمُوۡسَی اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـہًا کَمَا لَہُمۡ اٰلِـہَۃٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ تَجۡہَلُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا۔ پس ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں سے لگے بیٹھے تھے، کہنے لگے اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے! جیسے ان کے یہ معبود ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ارضِ مقدس میں داخل ہونے اور وہاں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَ لَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِکُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ۔

اے میری قوم والو! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے نام لکھ دی ہے اور اپنی پشت کے بل رو گردانی نہ کرو کہ پھر نقصان میں جا پڑو۔ (المائدہ: 21)

یہ سارے دلائل ثابت کرتے ہیں کہ ارضِ مقدس انبیاءؑ کا مسکن رہا ہے۔ یہاں انبیاءؑ مبعوث ہوئے، انہوں نے توحید اور وحدانیت کا درس دیا، پیغامِ خداوندی کو لوگوں تک پہنچایا اور یہیں اسی ارضِ مقدس میں مدفون بھی ہوئے۔ چنانچہ آج ہم کئی انبیاءؑ کے مزارات ارضِ مقدس میں دیکھتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ علاقہ انبیاءؑ کا مسکن، مبعث اور مرقد ہے۔

2. فرشتوں کی قیام گاہ

ہمیشہ ملائک اس مبارک زمین پر اترتے رہے ہیں۔ اس نزول کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ارضِ مقدس میں مبعوث ہونے والے اور ہجرت کر کے تشریف لانے والے انبیاءؑ کی طرف وحی لانے کی غرض سے فرشتوں کا آنا جانا رہا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ارضِ مقدس فرشتوں کی مستقل قیام گاہ بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیثِ مبارکہ ہے۔ سیدنا زید بن ثابتؓ روایت کرتے ہیں کہ "رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہائے شام بابرکت ہے، ہائے شام

بابرکت ہے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ! شام کیسے بابرکت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے فرشتے اپنے مبارک پروں سے شام کو ڈھانپے رکھتے ہیں"۔(ترمذی، مسند احمد بن حنبل، طبرانی، حاکم)

یعنی فرشتے اپنے پروں سے ارضِ مقدس کو ڈھانپ لیتے ہیں اور دشمنوں سے مبارک زمین کی حفاظت کرتے ہیں۔

اسی طرح فلسطین خصوصاً بیت المقدس نہایت مبارک جگہ ہے۔ علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے ارضِ مقدس کو نہایت بابرکت بنایا ہے کیونکہ یہ انبیاءؑ کا مبعث و مستقر ہے"۔(فیض القدیر)

ابو عبد اللہ المنہاجیؒ فرماتے ہیں کہ "اللہ رب العزت نے اس کرہ ارض سے ارضِ مقدس کا انتخاب کیا پھر موسیٰؑ کو اس کی طرف بھیجا، داوٗدؑ کے لیے اسی ارضِ مقدس میں پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کیا۔ سلیمانؑ پر اسی ارضِ مقدس میں برکتیں نازل ہوئیں اور عیسیٰؑ کی یہیں ولادت باسعادت ہوئی، یہیں پرورش پائی اور یہاں سے آسمانوں پر اٹھائے گئے"(اتحاف الاخصا بفضائل المسجد الاقصیٰ)

3. محلِ انصاف

مسند احمد بن حنبل میں میمونہ بنت سعدؓ سے روایت ہے۔ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اللہ کے نبی! بیت المقدس کے بارے میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: "یہ محشر اور منشر کی زمین ہے"۔ یعنی اس مقام پر میدانِ محشر سجے گا، میزان قائم ہو گا، عدل و انصاف کا ترازو لگایا جائے گا، لوگوں کے لیے جنت و دوزخ کے فیصلے کیے جائیں گے، لوگوں کے اعمال کے لحاظ سے ان کے درجات اور مقامات کا تعین کیا جائے گا، حساب و کتاب ہو گا اور ایک ایک عمل کا جائزہ لیا جائے گا۔

پھر جائزہ لینے کے بعد وہاں سے لوگوں کو منتشر کر دیا جائے گا۔ کچھ لوگ جنت میں چلے جائیں گے اور کچھ کو جہنم کے راستے پر ڈال دیا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ يَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَةُ يَوۡمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوۡنَ۔

اور جس دن قیامت قائم ہو گی اس دن (جماعتیں) الگ الگ ہو جائیں گی۔

(الروم:14)

ابو عبد اللہ المنہاجیؒ فرماتے ہیں: برو زِ قیامت بیت المقدس میں انصاف کا ترازو قائم کیا جائے گا، اسرافیلؑ صور وہیں پھونکیں گے اور پھر لوگوں کو جنت اور جہنم کی طرف وہیں سے بھیجا جائے گا۔(اتحاف الاخصاص120)

ابن جوزی ؒ نے حضرت کعب ؓ کا قول نقل کیا ہے کہ "حساب وکتاب بیت المقدس میں ہو گا"(فضائل القدس ص137)

برکاتِ معنویہ کے آثار

جن برکات معنویہ کا ہم نے تذکرہ کیا ہے ان کے اثرات کے حوالے سے چار نکات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

1. زمانہء فتن میں اسلامی قلعہ
2. مجاہدین کی قیام گاہ
3. ہمہ وقت میدانِ جہاد میں
4. دشمنانِ دین سے انتقام کا جذبہ

1. زمانہء فتن میں اسلامی قلعہ

سرزمینِ بیت المقدس ہمیشہ سے اسلامی پیشواؤں کی قیام گاہ رہی ہے۔ خصوصاً جن شخصیات کو دیگر علاقوں میں مشکلات اور تکالیف کا سامنا ہوتا تھا وہ ارضِ مقدس کا رخ کرتے تھے اور وہیں جا کر قیام فرماتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا لوطؑ نے عراق سے ارضِ مقدس کی طرف ہجرت کی اور سیدنا موسیٰؑ نے فرعون اور آل فرعون کے ظلم و جبر سے نجات کے لیے بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا۔

کیونکہ ارضِ مقدس پر الٰہی برکات کا نزول مسلسل رہا ہے اور خود رسالت مآب ﷺ نے بھی اپنے فرامین کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ الٰہی برکات کا خاص نزول ارضِ مقدس پر ہوتا ہے۔

طبرانی نے سلمہ بن نفیل سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اسلام کا مسکن شام ہے" (مجمع الزوائد: 60/10)

یعنی جب اہلِ اسلام پر سخت وقت آئے گا، فتنے برپا ہوں گے، جان و ایمان کا خطرہ بڑھے گا اور لوگ ایک مضبوط سہارے کی تلاش میں ہوں گے تو اسلام اور اہلِ اسلام کا مسکن شام ہو گا۔

اسی طرح عبد اللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میں نے دیکھا کہ کتاب کی رحل (جس پر کتاب رکھی جاتی ہے۔ ٹپائی) میرے تکیے کے نیچے سے ہٹ گئی ہے اور میں نے اچانک دیکھا کہ ایک نور شام کی طرف چمک رہا ہے۔ سنو! جب ایمان فتنوں میں گھر جائے تو شام کو اپنا ٹھکانہ بنانا" (مجمع الزوائد: 10/57)

سالم بن عبد اللہؒ روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: " آخری زمانے میں خضر موت سے آگ نکلے گی اور لوگ جمع ہو جائیں گے۔ ہم نے کہا" یارسول اللہ ﷺ! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: "تم شام کو اپنا مسکن بنالینا" (مجمع الزوائد: 10/61)

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب زمانہ فتنوں سے بھر جائے گا۔ لوگ اپنے اردگرد مختلف فتنے دیکھیں گے، آزمائش میں مبتلا ہوں گے تو اس وقت آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق ہم نے شام میں بسیرا کرنا ہے تاکہ ہم فتنوں اور آزمائشوں سے محفوظ رہ سکیں۔ کیونکہ شام وہ علاقہ ہے جہاں خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا مسلسل نزول ہوتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ احادیث میں شام کا ذکر جہاں کہیں بھی ہوتا ہے تو اس سے مراد شام اور فلسطین کا سارا علاقہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے شام اور فلسطین کی تقسیم نہیں کی جاتی تھی اور رسالت مآب ﷺ کے فرامین میں شام اس تمام علاقے کے لیے بولا جاتا ہے۔

2 . مجاہدین کی قیام گاہ

معنوی برکات کے آثار میں سے ایک اثر یہ ہے کہ ارضِ مقدس ہمیشہ سے مجاہدین کی قیام گاہ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علاقہ اپنے شرف اور احترام کی وجہ سے میدانِ جنگ بنا رہتا ہے۔ مختلف مذاہبِ عالم اس مقام کو اپنے لیے باعثِ شرف سمجھتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں چنانچہ یہاں مجاہدین ہمہ وقت موجود رہتے ہیں اور ارضِ مقدس کی حفاظت کو یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

اسی لیے اہلِ فلسطین کی قسمت یہ ٹھہری کہ وہ ہمیشہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ طبرانی ابو درداءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: " اہلِ شام، ان کی آل اولاد، غلام اور باندیاں جزیرہ تک سب

اللہ کے راستے میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رہتے ہیں"۔ (مجمع الزوائد: (10/60

اسی طرح عبد اللہ بن حوالہؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "عنقریب تم شام ، عراق اور یمن میں لشکر بناؤ گے۔ ابنِ حوالہؓ نے پوچھا. یا رسول اللہ ﷺ! میں کس کا انتخاب کروں ؟ آپ نے جواب دیا: "تم شام کو لازماً چنو! کیونکہ یہ اللہ کی بہترین سرزمین ہے اور اللہ اس مبارک زمین کے لیے اپنے بہترین بندوں کو منتخب کرتا" ہے۔ مجمع الزوائد (10/58)

ان احادیث کی روشنی میں چند اہم نکات واضح ہوتے ہیں:

1. اس مبارک زمین میں مجاہدین کا لشکر جمع ہو گا۔ چونکہ اس علاقے میں ہمیشہ طویل جنگیں رہی ہیں۔ مختلف قوموں اور مذاہب نے اس مقام کو میدانِ جنگ بنایا ہے۔ کبھی اس علاقے کے حصول کے لیے اور کبھی بیت المقدس کو فتح کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ لہٰذا اہلِ اسلام کے جانباز مجاہدین کا یہاں لشکرِ جرار ہمیشہ موجود رہتا ہے جو اس مبارک سرزمین کی حفاظت پر مامور رہتا ہے۔ اور عبد اللہ بن

حوالہؓ کو رسول اللہ ﷺ خاص ہدایت فرمارہے ہیں کہ آپ نے اس لشکر میں لازماً شامل ہونا ہے۔

2. پہلی حدیث میں اہل شام کے مزاج کے بارے میں آگاہی مل رہی ہے کہ اہل شام ہمہ وقت جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور ان کی عادتِ شریفہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے تمام اہل و عیال سمیت راہِ خدا میں اپنی جانیں قربان کرنے اور ارضِ مقدس اور بیت المقدس کی حفاظت کی خاطر پیش پیش ہوتے ہیں۔ اس لیے جو ان سے جنگ کرے گا چاہے وہ ان کے علاقے پر قبضہ کرے یا ان کی سرحد پار کرنے کی کوشش کرے یا اس پر قابض ہونے کی کوشش کرے۔ یہ مجاہدین ملت انہیں ایسا کرنے سے روکیں گے اور ان سے اپنا وطن چھین کر رہیں گے۔ اس کی تازہ مثال حالیہ واقعات سے لی جا سکتی ہے۔ جب ساری دنیا اسرائیل کی عسکری طاقت کے سامنے سرنگوں تھی اس وقت فلسطینی مجاہدین نے اپنا سر اٹھایا، ایمان کا جوش ابھرا، استقامت کی دعا ہوئی، فتح کی نوید سنائی گئی، پروردگار سے اعانت طلب گئی اور پھر ایسا حملہ کیا کہ ساری دنیا

حیران رہ گئی۔ اسرائیل کی دفاعی صلاحیت اور طاقت ملیامیٹ ہوگئی اور ایمان سے مزین اجسام نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ اس بارے میں خود آنحضرت ﷺ نے آگاہ کیا تھا۔

3. دوسری حدیث میں ایک خاص توجیہہ ذکر کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ارضِ مقدس زمین کے تمام ٹکڑوں میں سے وہ خاص ٹکڑا ہے جسے پروردگار نے خود پسند کیا اور منتخب کیا۔ اور اپنے خاص چنیدہ بندوں کو اس کی طرف بلاتا ہے۔ حدیث کے الفاظ کے مطابق "کھینچتا" ہے۔ یہ نہایت دلچسپ نکتہ ہے اور اس بارے میں قرآن کریم سے کئی نظیریں بھی ملتی ہیں۔ جیسے سیدنا ابراہیمؑ، سیدنا لوطؑ، سیدنا داوٗدؑ اور سیدنا سلیمانؑ ۔ان تمام انبیاءؑ کے واقعات اور ان کے مختصر تذکرے تو پہلے بھی ہو چکے ہیں مگر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس خاص برکت اور وصف کی کئی مثالیں قرآن مجید میں بھی ذکر کی گئی ہیں۔

4. ان احادیث صحیحہ کی روشنی میں "راہِ خدا میں پہرداری" کا وصف اہل فلسطین کو حاصل ہوا ہے۔ یہ بات خاص طور پر پیش نظر رہے کہ اس سے مراد ہر شامی یا فلسطینی نہیں ہے کہ وہ راہ خدا میں پہردار

ہے۔ بلکہ یہ نعمت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو پہر داری کی نیت سے وہاں مقیم ہیں یا انہوں نے اپنی خدمات اس کے لیے وقف کی ہیں۔ نیت کی شرط بخاری شریف کی دوسری حدیث کی رو سے ہر عمل کے لیے ضروری ہے۔ ممکن ہے وہاں مقیم افراد میں وہ لوگ بھی شامل ہوں جو اس کاز سے اتفاق ہی نہیں کرتے اور ممکن ہیں کچھ لوگ دیگر مقاصد کے حصول کے لیے وہاں مقیم ہوں۔ لہٰذا اس نعمت کا حق دار صرف وہ ہی فلسطینی ہو گا جو اس نیت اور ارادے سے وہاں قیام پذیر ہو کہ میں بیت المقدس کی حفاظت کروں گا۔

اس میں قلت و کثرت کا اعتبار نہیں ہے۔ جو شخص جس قدر معاونت کرے گا اور اس مقدس زمین کی حفاظت کے لیے اپنی جان، مال، وقت اور صلاحیتیں صرف کرے گا۔ وہ شخص راہ خدا میں پہر دار شمار ہو گا۔ کیونکہ خود رسالت مآب ﷺ کے ارشادِ مبارک میں یہ الفاظ ہیں: "ایک دن کی پہر داری، اور ایک رات کی پہر داری"۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں: "اس سے مراد یہ ہے کہ ایک لمحے کی پہر داری بھی ہو تو وہ بھی اسی میں شمار ہو گی"

رسول اللہ ﷺ نے راہِ خدا میں پہرداری کی خاص فضیلت بیان فرمائی ہے۔ جو شخص کسی سرحد پر اس ارادے سے جائے کہ وہ وہاں پہرداری کرے گا اور دشمنوں سے حفاظت کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا اجر روزے دار اور تہجد گزار سے زیادہ رکھا ہے اور اگر اسی حال میں فوت ہو جاتا ہے تو وہ شہیدوں میں شمار ہو گا۔ اسے بھی ویسے ہی رزق پہنچایا جائے گا جیسا کہ شہیدوں کو پہنچایا جاتا ہے اور اسے قبر کے عذاب سے بھی محفوظ رکھا جائے گا۔ اور اس کا اجر بھی جاری رہے گا۔

سہل بن سعدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "راہِ خدا میں ایک دن پہرداری کرنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے" (بخاری:3/224)

سلمانؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "راہِ خدا میں ایک دن اور رات پہرداری کرنا ایک مہینہ روزے رکھنے اور قیام الیل سے بہتر ہے۔ اگر وہ اسی حال میں فوت ہو گیا تو

اس کا اجر جاری رہے گا، اسے رزق پہنچایا جائے گا اور قبر کے عذاب سے محفوظ ہو گا۔"(مسلم:1530/ 3)

ان احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ جو شخص راہِ خدا میں پہرداری کا فریضہ انجام دیتا ہے اور پھر اسی حال میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شہیدوں کا اجر عطا فرماتے ہیں، اس کا رزق جاری کیا جاتا ہے، اس کی روح کو خوبصورت پرندوں کا جسم دیا جاتا ہے جن کے ذریعے وہ جنت کی سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہاں کے پھل اور دیگر نعمتیں حاصل کرتے ہیں اور انہیں قبر کے عذاب سے بھی محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اور یہ خاص فضائل ان لوگوں کو بھی حاصل ہیں جو ارضِ مقدس کی حفاظت کی نیت سے وہاں مقیم ہیں۔ ان کی حفاظت کو یقینی بنانے اور دشمنوں کے چنگل اور قبضے سے آزاد کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں "راہِ خدا کے پہردار" کا لقب عطا کیا ہے۔

3. ہمہ وقت میدانِ جہاد میں

اہلِ شام و فلسطین کے بارے میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فلسطین اور بیت المقدس کے اطراف کا علاقہ وہ ہے جہاں جہاد مسلسل جاری رہے گا۔ مجاہدین گروہ در گروہ وہاں جمع ہوتے رہیں گے، دینِ خداوندی کی نصرت کا ساماں کریں گے، دشمنانِ دین سے ہمہ وقت جہاد کریں گے۔ یہ بات جہاں ان کے پختہ اور خالص ایمان کی نشاندہی کرتی ہے وہیں ان کی شجاعت و بہادری کے فطری جوہر کو بھی واضح کرتی ہے۔ چنانچہ ہم چند احادیثِ صحیحہ کو صرف اس لیے پیش کر رہے ہیں تاکہ ہمارے اس دعوے کی صداقت کا یقین ہو جائے۔

امام احمدؒ ابی امامۃ سے مرفوعاروایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ ظالم دشمنوں کے خلاف حق پر قائم رہے گی یہاں تک کہ اللہ کا امر (یعنی موت) آئے گا اور وہ اسی حال میں ہوں گے۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کہاں ہوں گے؟ آپ نے جواب دیا: "بیت المقدس اور اس کے اطراف میں ہوں گے" (مسند احمد 5/269)

ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "میری امت میں سے ایک جماعت دمشق اور اطرافِ دمشق میں اور بیت المقدس اور اطرافِ بیت المقدس میں لڑتی رہے گی اور یہ قیامت تک حق پر ثابت قدم رہیں گے "۔(مجمع الزوائد 60/10)

ان احادیثِ مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بیت المقدس اور اس کے اطراف میں رہنے والے لوگ وہ ہیں جو ہمیشہ دین کی نصرت کا کام کریں گے۔ خدا تعالیٰ نے انہیں اپنی مدد کے لیے قبول فرمایا ہے۔ ان کی بہادری اور شجاعت کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ جہاں ان کے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں، تلواروں کے کاری وار کا نقش، جنگی مہارتوں کے قصیدے، شجاعت کی حیرت انگیز داستانیں اس طرح رقم ہیں کہ انسانی دماغ ان کو پڑھتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

4. دشمنانِ دین سے انتقام کا جذبہ

فلسطینی باسیوں کے مزاج اور طبیعت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ دین کے دشمن سے بہترین انتقام لینے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اپنے دشمن کو بھاری نقصان

پہنچائے بغیر ان کی روح کو چین نہیں ملتا۔ پروردگار نے ان کی طبیعت کو ایسے تخلیق کیا ہے کہ انتقامی کاروائی ان کی زندگی کا جزولاینفک بن چکا ہے۔

اور کیوں نہ ہو کہ خود اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین میں اپنا کوڑا قرار دیا ہے۔

خریم بن فاتک الاسدیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اہلِ شام زمین میں اللہ کا کوڑا ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس سے چاہتے ہیں ان کے ذریعے انتقام لے لیتے ہیں"۔(مجمع الزوائد:10/ 60-61)

یعنی پروردگار نے اس دنیا میں کفار اور ظالموں کو سبق سکھانے کے لیے فلسطینیوں کو پیدا کیا تاکہ ان کے ذریعے ظالموں کو جکڑا جا سکے۔

قبۃ الصخرہ کا مقام و مرتبہ

جس طرح بیت اللہ میں حجرِ اسود نصب ہے۔ اسی طرح بیت المقدس میں قبۃ الصخرۃ کو رکھا گیا ہے۔ اس کے شرف و تقدس کی بہت ساری وجوہات ہیں:

1. یہ وہ پتھر ہے کہ جس پر کھڑے ہو کر اسرافیلؑ صور پھونکیں گے۔ روحیں جسموں میں ضم ہوں گی۔ لوگ اپنی قبروں سے اٹھیں گے اور اسی مقام کی طرف بھاگتے ہوئے جمع ہونا شروع ہو جائیں گے۔

2. یہ وہ پتھر ہے جہاں سے رسول اللہ ﷺ معراج کی رات آسمانوں کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔
3. یہ ہی وہ مقام ہے جہاں سے فرشتے آسمانوں کی طرف جاتے ہیں۔
4. اس مقام پر کھڑے ہو کر بروزِ قیامت لوگوں کو بلایا جائے گا۔ ہر ایک کا نام لے کر منادی کی جائے گی۔ اور منادی کرنے والا اس مقام پر کھڑا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے بیان کی گئی ہے کہ یہ آسمان کے قریب ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اسۡتَمِعۡ یَوۡمَ یُنَادِ الۡمُنَادِ مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ ﴿۴۱﴾

اور سن لیں کہ جس دن ایک پکارنے والا قریبی جگہ سے پکارے گا۔ (سورۃ ق:41)

مفسرین کرام اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اسرافیلؑ قبۃ الصخرۃ پر کھڑے ہو کر آواز لگائیں گے "اے لوگو: اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ فیصلے کے لیے جمع ہو جاؤ"۔ اسے ہی نفخہ ثانیہ کہتے ہیں۔

5. قبۃ الصخرۃ کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ پتھر جنت سے لایا گیا ہے اور یہ بھی اسی طرح کا پتھر کا ہے جو کعبۃ اللہ میں نصب ہے۔ یعنی

دونوں پتھر جنت سے یہاں بھیجے گئے ہیں۔ ایک ہی مضمون کی روایت عبد اللہ بن عباسؓ، مکحولؒ، حضرت کعبؓ اور انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ "قبۃ الصخرۃ جنت کے پتھروں میں سے ایک پتھر ہے"۔(فضائل القدس:139)

بیت المقدس کی تعمیر

سوال یہ ہے کہ بیت المقدس کو سب سے پہلے کس نے تعمیر کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر صدیوں سے بحث ہو رہی ہے۔ تمام مذاہبِ عالم کے ماننے والے اپنے دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بیت المقدس ان کی ملکیت ہے۔ یایوں کہہ لیجیے کہ دیگر مذاہب کے مقابلے میں ان کے لیے زیادہ مقدس ہے۔

یہود کا خیال ہے کہ یہ وہ شہر ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو داخلے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ ہم بنی اسرائیلی ہیں اسی لیے یہ شہر ہمارے لیے مقدس ہے۔ اور دوسری دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام نے یہاں ہیکل سلیمانی تعمیر کیا تھا۔ بعد میں لوگوں نے اس کو منہدم کر کے یہاں

مسجد الاقصیٰ کی بنیاد رکھ دی۔ دیوارِ گریہ کو بطور نشانی بھی بتلاتے ہیں کہ یہ دیوار ہیکل سلیمانی کی یادگار کے طور پر ہے۔

عیسائیوں کا کہنا ہے کہ یہ مقام ہمارے لیے زیادہ مقدس اس لیے ہے کہ یہاں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، یہیں ان کی پرورش ہوئی، یہاں ہی انہوں نے تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا اور یہیں انہیں مصلوب کیا گیا (ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے حکم سے آسمانوں پر زندہ اٹھالیا)۔ اس لیے یہ مقام ان کے لیے احترام کی جگہ ہے۔

مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ مقام ان کے لیے مقدس ہے کہ قرآن کریم میں پروردگار نے اس کی تقدیس کو بیان کیا۔ اس زمین کو قرآن کریم میں "ارضِ مقدس" کے نام سے پکارا گیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اس مقام پر تمام انبیاء کی ارواح کو نماز کی جماعت کروائی تھی۔ اور اسلام چونکہ ایک دائمی مذہب ہے۔ آدمؑ سے لے کر رسالت مآب ﷺ تک ایک ہی دین خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا۔ اس دین کی اشاعت کے لیے مختلف انبیاءؑ کو مبعوث کیا گیا۔ لیکن دین ہمیشہ ایک رہا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد تمام

سابقہ انبیاء کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں اور ایک شریعتِ محمدی قابلِ عمل قرار دی گئی۔

اسی کے ساتھ اس تصور کو منسلک کیجیے کہ جن مقامات کے تقدس کو خدا تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کیا ہے۔ یہ مقامات انہی لوگوں کے لیے زیادہ مقدس ہوں گے جو اس کے دین و احکام کے پیرو کار ہوں گے۔ اس دین کے مخالف کس منہ سے دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس خدا کے مقرر کردہ مقدس مقامات ہمارے لیے بھی ویسے ہی مقدس ہیں کہ جس کے پیغام اور حکم کا ہم علی الاعلان انکار کرتے ہیں اور اس کے بھیجے ہوئے نبی کی تصدیق کرنے سے گریزاں ہیں۔ جب اس خدا کے حکم، اس کے پیغمبر و قاصد اور اس کے بھیجے ہوئے کلام کے منکر ہوں تو پھر یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ ہم اسی خدا کے بنائے ہوئے مقدس مقامات کے والی و وارث ہیں؟

اور یہاں بیت المقدس کی تعمیر کے حوالے سے چند ضروری باتوں کو مختصراً اور جامع انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ بیت المقدس کی بنیاد اور تعمیر کے حوالے سے ذہن میں بیٹھے ہوئے مختلف اشکالات دور ہو سکیں۔

اس کرہ ارض پر سب سے پہلی مسجد "مسجد الحرام" تعمیر ہوئی اور دوسری مسجد "مسجد الاقصیٰ" تعمیر ہوئی۔ بخاری شریف میں ابوذرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! اس کرہ ارض پر پہلی مسجد کون سی بنائی گئی؟ آپ نے فرمایا: مسجد الحرام! میں نے پوچھا: پھر کون سی؟ آپ نے جواب دیا کہ "مسجد الاقصیٰ"، میں نے پوچھا ان دونوں میں کتنے عرصے کا وقفہ ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ "چالیس سال" (صحیح بخاری: 117/4)

اس حدیث مبارکہ سے ثابت ہوا کہ مسجد الاقصیٰ کی تعمیر مسجد الحرام کی تعمیر کے چالیس سال بعد ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ مسجد الحرام کی تعمیر کب ہوئی؟ تاکہ اس کی تعمیر کا زمانہ جاننے کے بعد مسجد الاقصیٰ کی تعمیر کا زمانہ جاننے میں آسانی ہو۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو زمین میں ایک گھر بنانے کا حکم دیا تاکہ وہ اس کا طواف کر سکیں۔ اور یہ حکم اس وقت دیا گیا جبکہ ابھی آدمؑ کی تخلیق نہیں ہوئی تھی۔ پھر آدمؑ نے انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیرِ نو کی پھر اس کا طواف کیا۔ اس کے بعد پھر

بیت اللہ منہدم ہو گیا اور پھر ابراہیمؑ نے اس کی تعمیر کی۔ (الجامع لاحکام القرآن:138/4)

اس حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ پہلے بیت اللہ کی تعمیر فرشتوں نے کی اور اس وقت کی جبکہ ابھی آدمؑ کا وجود نہیں تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم فرشتوں کو اس لیے تھا کہ وہ زمین پر ایک ایسے گھر کی تعمیر کریں جس کا وہ طواف کر سکیں۔ اور پھر آدمؑ جب دنیا میں تشریف لائے تو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کو تعمیر کیا جن پر پہلے فرشتوں نے کیا تھا۔

یہاں اب دو احتمالات ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ مسجد الاقصیٰ کو بھی فرشتوں نے تعمیر کیا ہو گا جیسا کہ انہوں نے بیت اللہ کو تعمیر کیا تھا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس طرح آدمؑ نے بیت اللہ کو تعمیر کیا اسی طرح خود بیت المقدس کو تعمیر کیا ہو گا جیسا کہ حدیث میں بیت اللہ کی تعمیرِ نو کا تذکرہ ہے کہ وہ آدمؑ نے دنیا میں تشریف آوری کے بعد کی تھی۔ اور یہ دونوں احتمالات احادیثِ صحیحہ میں غور و خوض کرنے بعد ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ سلیمانؑ وہ پہلے شخص نہیں ہیں جنہوں نے

بیت المقدس کی تعمیر کی۔ بلکہ پہلی تعمیر فرشتوں نے کی یا آدمؑ نے کی اور ممکن ہے کہ سلیمانؑ نے تعمیرِ نو کی ہو۔

ارضِ مقدس اور سرزمینِ اسلام

مکہ کی وادی سے بلند ہونے والی ایک تنہا آواز جو توحید کا علم اٹھا کر، وحدانیت کا درس دے کر، اخلاقیات کا منشور دے کر اور امن کا مشن لے کر دلوں پر دستک دینے لگی، لوگ جوق در جوق اس آواز پر لبیک کہنے لگے تو مکہ کے ظالم اور ناشکرے لوگوں سے یہ مخلص آواز برداشت نہ ہوئی اور انہوں نے اسے خاموش کروانے کا طریقہ ڈھونڈ لیا۔

لیکن خدا تعالیٰ نے اس آواز کو مدینۃ الرسول کی صورت میں ریاست مدینہ کا وجود دے دیا۔

ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ اس مشن کا اہم جزو تھا کہ ہم نے دنیا میں بسنے والے ہر ایک انسان کے کانوں تک یہ آواز پہنچانی ہے۔ اس مشن سے روشناس کروانا ہے، اس پیغام سے آگاہی دینی ہے۔ دنیا کے ایک ایک

کونے تک پہنچ کر لوگوں کو باور کروانا ہے کہ تمہاری بھلائی کا ساماں یہاں موجود ہے۔

اسی لیے پروردگار بھی اس عمل میں موحدین کے ساتھ ہوئے اور ایک خاص واقعہ رونما ہوا۔

شہنشاہ روم نے ایک رات خواب دیکھا اور نہایت غم و حزن کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور یہ خوف بدستور بادشاہ کے دل میں رہا۔ کہ ایک دن ایک غلام نے بادشاہ کے کان میں آکر بتایا کہ عرب سے کچھ تاجر ہمارے ملک میں آئے ہوئے ہیں۔

عبداللہ بن عباسؓ سے ابوسفیانؓ بن حرب نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ہرقل (شاہ روم) نے ان کے پاس قریش کے قافلے میں سے ایک آدمی بلانے کو بھیجا اور اس وقت یہ لوگ تجارت کے لیے ملک شام گئے ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ ﷺ نے قریش اور ابوسفیان سے ایک وقتی معاہدہ کیا ہوا تھا۔ جب ابوسفیان اور دوسرے لوگ ہرقل کے پاس ایلیاء پہنچے جہاں ہرقل نے دربار میں طلب کیا تھا۔ اس کے گرد روم کے بڑے بڑے لوگ (علماء وزراء امراء) بیٹھے ہوئے تھے۔ ہرقل نے ان کو اور اپنے ترجمان کو بلوایا۔

پھر ان سے پوچھا کہ تم میں سے کون شخص مدعی رسالت کا زیادہ قریبی عزیز ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ میں بول اٹھا کہ میں اس کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہوں۔ (یہ سن کر) ہرقل نے حکم دیا کہ اس کو (ابوسفیان کو) میرے قریب لاکر بٹھاؤ اور اس کے ساتھیوں کو اس کی پیٹھ کے پیچھے بٹھا دو۔ پھر اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں ابوسفیان سے اس شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات پوچھتا ہوں۔ اگر یہ مجھ سے کسی بات میں جھوٹ بول دے تو تم اس کا جھوٹ ظاہر کر دینا، (ابوسفیان کا قول ہے کہ) اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ غیرت نہ آتی کہ یہ لوگ مجھ کو جھٹلائیں گے تو میں آپ ﷺ کی نسبت ضرور غلط گوئی سے کام لیتا۔

خیر پہلی بات جو ہرقل نے مجھ سے پوچھی وہ یہ کہ اس شخص کا خاندان تم لوگوں میں کیسا ہے؟ میں نے کہا وہ تو بڑے عالی نسب والے ہیں۔

کہنے لگا اس سے پہلے بھی کسی نے تم لوگوں میں ایسی بات کہی تھی؟ میں نے کہا نہیں۔

پھر کہنے لگا، اچھا اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔

پھر اس نے کہا، بڑے لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے یا کمزوروں نے؟ میں نے کہا نہیں، کمزوروں نے۔

پھر کہنے لگا، اس کے تابعدار روز بڑھتے جاتے ہیں یا کوئی ساتھی چھوڑ بھی جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں چھوڑ کر جاتے۔

کہنے لگا کہ کیا اپنے اس دعوے (نبوت) سے پہلے کبھی (کسی بھی موقع پر) اس نے جھوٹ بولا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ اور اب ہماری اس سے (صلح کی) ایک مقررہ مدت ٹھہری ہوئی ہے۔ معلوم نہیں وہ اس میں کیا کرنے والا ہے۔ (ابوسفیان کہتے ہیں) میں اس بات کے سوا اور کوئی (جھوٹ) اس گفتگو میں شامل نہ کر سکا۔

ہرقل نے کہا کیا تمہاری اس سے کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں۔ بولا پھر تمہاری اور اس کی جنگ کا کیا حال ہوتا ہے؟ میں نے کہا، لڑائی ڈول کی طرح ہے، کبھی وہ ہم سے (میدان جنگ) جیت جاتے ہیں اور کبھی ہم ان سے جیت جاتے ہیں۔

ہرقل نے پوچھا! وہ تمہیں کس بات کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا وہ کہتا ہے کہ صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور اپنے باپ دادا

کی (شرک کی) باتیں چھوڑ دو اور ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پرہیز گاری اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔

(یہ سب سن کر) پھر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ابوسفیان سے کہہ دے کہ میں نے تم سے اس کا نسب پوچھا تو تم نے کہا کہ وہ ہم میں عالی نسب ہے اور پیغمبر اپنی قوم میں عالی نسب ہی بھیجے جاتے ہیں۔

میں نے تم سے پوچھا کہ (دعویٰ نبوت کی) یہ بات تمہارے اندر اس سے پہلے کسی اور نے بھی کہی تھی، تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، تب میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ اگر یہ بات اس سے پہلے کسی نے کہی ہوتی تو میں سمجھتا کہ اس شخص نے بھی اسی کی تقلید کی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے بڑوں میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے، تم نے کہا کہ نہیں۔ تو میں نے (دل میں) کہا کہا گر ان کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہو گا تو کہہ دوں گا کہ وہ شخص (اس بہانے) اپنے آباء واجداد کی بادشاہت اور ان کا ملک (دوبارہ) حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس بات کے کہنے (یعنی پیغمبری کا دعویٰ کرنے) سے پہلے تم نے کبھی اس پر دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے؟ تم نے کہا کہ نہیں۔ تو

میں نے سمجھ لیا کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ دروغ گوئی سے بچے وہ اللہ کے بارے میں کیسے جھوٹی بات کہہ سکتا ہے؟۔

اور میں نے تم سے پوچھا کہ بڑے لوگ اس کے پیرو ہوتے ہیں یا کمزور آدمی۔ تم نے کہا کمزوروں نے اس کی اتباع کی ہے، تو (دراصل) یہی لوگ پیغمبروں کے متبعین ہوتے ہیں۔

اور میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے ساتھی بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں۔ تم نے کہا کہ وہ بڑھ رہے ہیں اور ایمان کی کیفیت یہی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ کامل ہو جاتا ہے۔

اور میں نے تم سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص اس کے دین سے ناخوش ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ تم نے کہا! نہیں، تو ایمان کی خاصیت بھی یہی ہے جن کے دلوں میں اس کی مسرت رچ بس جائے وہ اس سے لوٹا نہیں کرتے۔

اور میں نے تم سے پوچھا کہ کیا وہ کبھی عہد شکنی کرتے ہیں؟ تم نے کہا! نہیں، پیغمبروں کا یہی حال ہوتا ہے، وہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

اور میں نے تم سے کہا کہ وہ تمہیں کس چیز کا حکم دیتے ہیں؟ تم نے کہا وہ ہم سے کہتے ہیں کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ

اور تمہیں بتوں کی پرستش سے روکتے ہیں۔ سچ بولنے اور پرہیز گاری کا حکم دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ باتیں جو تم کہہ رہے ہو سچ ہیں تو عنقریب وہ اس جگہ کا مالک ہو جائے گا کہ جہاں میرے یہ دونوں پاؤں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ (پیغمبر) آنے والا ہے۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہارے اندر ہو گا۔ اگر میں جانتا کہ اس تک پہنچ سکوں گا تو اس سے ملنے کے لیے ہر تکلیف گوارا کرتا۔ اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔

ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کا وہ خط منگوایا جو آپ نے دحیہ کلبیؓ کے ذریعہ حاکم بصریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس نے وہ خط ہرقل کے پاس بھیج دیا تھا۔ پھر اس کو پڑھا تو اس میں (لکھا تھا):

"اللہ کے نام کے ساتھ جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔

اللہ کے بندے اور اس کے پیغمبر محمد ﷺ کی طرف سے یہ خط شاہ روم کے لیے ہے۔ اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے اس کے بعد میں آپ کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اسلام لے آئیں گے تو (دین و دنیا میں) سلامتی نصیب ہو گی۔ اللہ آپ کو دوہرا ثواب دے گا اور اگر آپ (میری دعوت سے) روگردانی کریں گے تو آپ کی رعایا کا گناہ بھی آپ

ہی پر ہو گا۔ اور اے اہل کتاب! ایک ایسی بات پر آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا رب بنائے۔ پھر اگر وہ اہل کتاب (اس بات سے) منہ پھیر لیں تو (مسلمانو!) تم ان سے کہہ دو کہ (تم مانو یا نہ مانو) ہم تو ایک اللہ کے اطاعت گزار ہیں۔

ابوسفیانؓ کہتے ہیں: جب ہرقل نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا اور خط پڑھ کر فارغ ہوا تو اس کے ارد گرد بہت شور و غوغہ ہوا، بہت سی آوازیں اٹھیں اور ہمیں باہر نکال دیا گیا۔

تب میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابو کبشہ کے بیٹے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا (دیکھو تو) اس سے بنی اصفر (روم) کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔ مجھے اس وقت اس بات کا یقین ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ عنقریب غالب ہو کر رہیں گے۔ حتیٰ کہ اللہ نے مجھے مسلمان کر دیا۔

(راوی کا بیان ہے کہ) ابن ناطور ایلیاء کا حاکم ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا لاٹ پادری بیان کرتا تھا کہ ہرقل جب ایلیاء آیا، ایک دن صبح کو پریشان اٹھا تو اس کے درباریوں نے دریافت کیا کہ آج ہم آپ کی حالت بدلی

ہوئی محسوس کرتے ہیں۔ (کیا وجہ ہے؟) ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہر قل نجومی تھا، علم نجوم میں وہ پوری مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ہم نشینوں کو بتایا کہ میں نے آج رات ستاروں پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ ہمارے ملک پر غالب آ گیا ہے۔ (بھلا) اس زمانے میں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہود کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا۔ سو ان کی وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ سلطنت کے تمام شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجیے کہ وہاں جتنے یہودی ہوں سب قتل کر دیئے جائیں۔ وہ لوگ انہی باتوں میں مشغول تھے کہ ہر قل کے پاس ایک آدمی لایا گیا۔ جسے شاہ غسان نے بھیجا تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بیان کئے۔ جب ہر قل نے (سارے حالات) سن لیے تو کہا کہ جا کر دیکھو وہ ختنہ کئے ہوئے ہے یا نہیں؟ انہوں نے اسے دیکھا تو بتلایا کہ وہ ختنہ کیا ہوا ہے۔ ہر قل نے جب اس شخص سے عرب کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتلایا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں۔ تب ہر قل نے کہا کہ یہ ہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس امت کے بادشاہ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا اور وہ بھی علم نجوم میں ہر قل کی طرح ماہر تھا۔ پھر وہاں سے ہر قل حمص چلا گیا۔ ابھی حمص سے نکلا نہیں تھا کہ اس

کے دوست کا خط (اس کے جواب میں) آگیا۔ اس کی رائے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بارے میں ہر قل کے موافق تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (واقعی) پیغمبر ہیں۔ اس کے بعد ہر قل نے روم کے بڑے آدمیوں کو حمص کے محل میں طلب کیا اور اس کے حکم سے محل کے دروازے بند کر لیے گئے۔ پھر وہ (اپنے خاص محل سے) باہر آیا اور کہا ”اے روم والو! کیا ہدایت اور کامیابی میں کچھ حصہ تمہارے لیے بھی ہے؟ اگر تم اپنی سلطنت کی بقا چاہتے ہو تو پھر اس نبی کی بیعت کر لو اور مسلمان ہو جاؤ“ (یہ سننا تھا کہ) پھر وہ لوگ وحشی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑے (مگر) انہیں بند پایا۔ آخر جب ہر قل نے (اس بات سے) ان کی یہ نفرت دیکھی اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو کہنے لگا کہ ان لوگوں کو میرے پاس لاؤ۔ (جب وہ دوبارہ آئے) تو اس نے کہا میں نے جو بات کہی تھی اس سے تمہاری دینی پختگی کی آزمائش مقصود تھی سو وہ میں نے دیکھ لی۔ تب (یہ بات سن کر) وہ سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور اس سے خوش ہو گئے۔ بالآخر ہر قل کی آخری حالت یہ ہی رہی۔ (صحیح بخاری, حدیث نمبر:7)

یہ خوف و دہشت کفار کے دلوں میں خداوندِ عالم نے ڈال دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شہنشاہِ روم ارضِ مقدس پر قابض تھا۔ اور بیت المقدس بھی اسی کے قبضے میں تھا۔ یہ خوف و دہشت کا سلسلہ صرف خواب کی حد تک نہ تھا۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ آگے بڑھ کر مسلمانوں نے عملاً اس دہشت کو ان کے دل و دماغ پر سوار کیا۔ اسلامی سرحدات کو ارضِ مقدس تک لے جانے کے لیے کی جانے والی جدوجہد کے سلسلے میں پہلا معرکہ سیدنا زید بن حارثہؓ کی قیادت میں ہوا۔ بہادری، شجاعت، دلیری اور جانفشانی کے وہ مناظر اس جنگ میں دیکھائی دیے کہ آسمانِ دنیا نے اس سے پہلے ایسے مناظر نہ دیکھے ہوں گے۔

غزوہِ مؤتہ میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار جبکہ کفار کی تعداد دو لاکھ تھی۔ سب سے پہلے زید بن حارثہؓ قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھے اور انہیں کفار نے گھیر لیا۔ وہ بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ان کے بعد علمِ لشکر تینتیس سالہ جعفر طیارؓ نے اٹھالیا اور کفار سے دوبدو ہونے لگے۔ آپ اپنے گھوڑے پر سوار تھے اور دشمنوں کی گردنوں کو تن سے جدا کر کے جہنم واصل کر رہے تھے۔ دشمنانِ اسلام کا گھیرا تنگ ہوا تو آپ گھوڑے سے

اتر کر کفار کی صفوں کو کاٹ کر ان میں آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔ ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ میں بھی اسی جنگ میں تھا۔ ہم نے انہیں تلاش کیا تو ہم نے دیکھا کہ آپ شہید ہو چکے ہیں اور ہم نے ان کے جسم پر نیزوں اور تیروں کے نوے (90) زخم دیکھے اور کوئی زخم بھی ان کی پیٹھ پر نہیں تھا۔ ان کے بعد ثابت بن ارقمؓ نے علم اٹھایا اور کہا کہ اے مسلمانو! تم اپنے درمیان کسی ایک بندے کا انتخاب کرو۔ تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ یہ پرچم اٹھائیں گے ؟ انہوں نے انکار کر دیا اور پھر لوگوں نے سیدنا خالد بن ولیدؓ کو منتخب کیا اور پھر وہ اس بہادری کے ساتھ لڑے کہ ان کے ہاتھ میں اس دن نو تلواریں ٹوٹ گئیں۔

ہجرت کے نویں سال آپؐ کو ایک اطلاع موصول ہوئی کہ قیصر روم بہت بڑا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھائی کے ارادے سے آ رہا ہے۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک ایسا حملہ کرے گا جس سے ریاست مدینہ کا وجود ختم ہو جائے گا۔ آنحضرتؐ نے اعلان کیا کہ اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کرے ہم اس حملے اور جنگ کی ابتداء کرتے ہیں۔ اور آپؐ نے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ اور یہ ایک ایسا اعلان تھا جس میں ہر ایک شخص کو شامل ہونے کا حکم دیا گیا۔ بغیر کسی عذر

کے گھر بیٹھنے اور پیچھے رہنے کی اجازت نہ تھی۔ صحابہ کرامؓ نے جان و مال کے ساتھ اس جنگ کی تیاری کی اور جنگ کے ارادے سے جزیرہ عرب کے شمال میں اور شام کی سرحد پر واقع تبوک کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے اور دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن پروردگار نے ایسا خوف قیصرِ روم کے دل میں ڈال دیا تھا کہ وہ آپ کی لشکر کشی کی خبر سن کر سہم گیا اور جنگ کا ارادہ ترک کر دیا۔ آپؐ نے کچھ عرصہ وہاں قیام کیا، قبائل سے ملاقاتیں کیں، بیعت ہوئی ،چنداں نے جزیہ دینے کا وعدہ کیا اور یوں آپ واپس مدینہ منورہ تشریف لائے۔ چند دن بعد آپؐ نے ایک لشکر ترتیب دینا شروع کیا جس کی قیادت اسامہ بن زیدؓ کے سپرد کی اور آپؐ نے انہیں ارضِ مقدس فلسطین کی طرف لشکر کشی کا مکمل لائحہ عمل دیا۔ لیکن حضورؐ اس لشکر کشی کے مناظر کو دیکھ نہ سکے اور فتوحات کی خوشخبری کو سن نہ سکے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو اپنے پاس بلا لیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ارضِ مقدس یعنی فلسطین کی طرف مسلمانوں کی لشکر کشی کی کیا وجہ تھی؟ شام اور فلسطین کی طرف پیش قدمی کیوں کی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے مختلف اسباب تھے جو کہ درج ذیل ہیں:

1. قبلہ اوّل
2. سفر معراج میں حضور ﷺ کی آرام گاہ
3. عرب قبائل کی سکونت

1. قبلہ اوّل

مکہ مکرمہ میں آنحضرتؐ بیت المقدس کی طرف رخِ انور کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حضورؐ کی ایک خوبصورت ادا یہ تھی کہ آپ کعبۃ اللہ اور بیت المقدس دونوں کو جمع کرتے تھے یعنی دونوں کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ بیت اللہ کے دو ارکان کے درمیان شمال کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے تو یوں جمع قبلتین ہو جاتا تھا۔ مگر جب مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو حکم ہوا کہ بیت المقدس کی طرف چہرہ مبارک کا رخ کیجیے۔ یہ ہی صورت حال سولہ سترہ ماہ رہی اور پھر اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کا حکم دیا اور یوں آپؐ نے نماز کے دوران ہی قبلہ تبدیل کر لیا۔ یہ واحد نماز تھی جو دو قبلوں کی طرف رخ کر کے ادا کی گئی اور مسجد ذو قبلتین وہ واحد مسجد ہے جس میں دو قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی گئی۔

صحیح بخاری میں براء بن عازبؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ "جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی "(صحیح بخاری:15/ 1)

اس حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ بیت المقدس کی طرف چہرہ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ چونکہ یہ اسلام کی نشانیوں، علامات اور شعائر میں سے ہے اس لیے مسلمان کبھی بھی اس سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ دوسرا پہلو اس میں خاص یہ ہے کہ حضورؐ مکہ مکرمہ میں دونوں قبلوں کو جمع فرماتے تھے جس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ بیت المقدس کی عظمت و شرف کے قائل تھے اور نیکیوں کی طلب کے لیے دونوں قبلوں کی طرف رخ کرتے تھے۔ اسی سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ دونوں قبلوں میں فرق نہیں کیا۔ دونوں کے تقدس، شرف و احترام اور برکت کا سبق دیا اور پیغام دیا کہ ان دونوں قبلوں میں کس قدر قرب و وصال ہے۔ چنانچہ مسلمان کبھی بھی اپنے قبلہ سے ،اس کے تقدس، شرف، احترام اور برکت سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ ان شاءاللہ

2. سفر معراج میں حضور ﷺ کی آرام گاہ

معراج کا سفر یعنی دنیا سے آسمان دنیا کا سفر اور پھر وہاں سے عرشِ بریں تک۔ اس مبارک سفر کو معراج کہتے ہیں۔ جب جبرائیل امینؑ آپؐ کو براق پر سوار کر کے سفر پر روانہ ہوئے تو مسجد اقصیٰ میں پڑاؤ کیا۔ حضورؐ نے اپنی سواری کو مسجد کے ایک کونے میں باندھا اور مسجد اقصیٰ میں تحیۃ المسجد کی نیت سے دو نفل ادا کیے اور پھر آسمان کا سفر شروع ہو گیا۔ ہر آسمان پر انبیاءؑ سے ملاقاتیں ہوئیں اور آخری آسمان پر اپنے دادا ابراہیمؑ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور پھر سدرۃ المنتہیٰ اور عرشِ معلیٰ تک پہنچے۔ پروردگار سے ملاقات، جنت و دوزخ کے مشاہدے کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا۔ تمام انبیاءؑ آپؐ کو رخصت کرنے کے لیے مسجد اقصیٰ تک تشریف لائے اور یہاں آپؐ نے تمام انبیاءؑ کی امامت کروائی اور سب نے آپؐ کی امامت میں نماز ادا کی۔ قرآن کریم نے سفر معراج کو سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں بیان کیا۔

اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ دونوں مساجد کے درمیان ربط و تعلق کس قدر گہرا ہے کہ جس طرح بیت اللہ مکہ کے باسیوں اور اسلام کے پیروں کے لیے مبارک ہے اسی طرح بیت المقدس بھی اسی پروردگار کی عبادت گاہ ہے وہ بھی ایسے ہی مقدس و محترم ہونی چاہیے۔ اور دوسری بات یہ

واضح ہوئی ہے کہ اس زمانے میں بیت المقدس ظالموں اور جابروں کے قبضے میں تھا۔ اس کی حالت خستہ اور ناگفتہ بہ تھی۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا نام نہیں پکارا جاتا تھا۔ اس لیے پیغام دیا گیا کہ دونوں مقدس مقامات کی حرمت وناموس اور آزادی سے غافل نہیں ہونا۔ یہاں خدا تعالیٰ کا نام ونظام ہمیشہ بلند رہے۔

3. عرب قبائل کی سکونت

فلسطین کی طرف پیش قدمی کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں عرب آباد تھے جن کی وجہ سے اس علاقے کی طرف پیش قدمی کی گئی اور یہ عرب صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ چنانچہ چند نام ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کون کون سے قبائل یہاں آباد تھے۔

أ۔ عاملہ

یہ حارث بن عدی کی اولاد میں سے ہیں۔ عاملہ بنت مالک کی طرف نسبت کی وجہ سے ان کا نام عاملہ ہو گیا۔ اصلاً یمنی باشندے تھے جنہوں نے شام کی طرف ہجرت کی تھی اور بحر مردار کے جنوب میں جاکر آباد ہوئے۔

ب۔ سلیح بن حلوان

یہ قبیلہ شام کی وادیوں میں رہتا ہے۔ کسی خاص مقام میں بسنے کے بجائے مختلف علاقوں میں ہجرت کرتے رہتے تھے۔

ج۔ جذام بن عدی

یہ جذام بن عدی کی اولاد ہیں۔ ان سے دو قبیلے بنے بنو جذم اور بنو حشم۔ دونوں الگ الگ جگہوں پر آباد ہوئے۔ بنو جذم شمالی فلسطین میں آباد ہوئے۔ انہوں نے ہی زید بن حارثہؓ، جعفر طیارؓ، عبد اللہ بن رواحہؓ اور خالد بن ولیدؓ کے ساتھ غزوہ مؤتہ میں جنگ کی تھی مگر جب اسلام لائے تو اسلام ان کے دل و جان میں بس گیا۔ اس کے بعد اسلامی فتوحات میں بہت مدد و کمک فراہم کی۔ آج بھی فلسطین کے بیشتر قبائل کی نسبت بنو جذم کی طرف کی جاتی ہے۔

د۔ لخم بن عدی

یہ مالک بن عدی کی اولاد ہیں جس کا لقب لخم تھا۔ بنو لخم مختلف جگہوں پر آباد رہے۔ کچھ رملہ اور مصر کے درمیان، کچھ جولان، کچھ فلسطین کے مختلف شہروں میں مقیم رہے۔ لیکن جب یہ یک جا ہوئے تو انہوں نے فلسطین میں بیت المقدس کے ارد گرد ڈیرہ جما لیا اور وہیں آباد ہو گئے۔

پھر ان میں سے آل منذر ہوئے جنہوں نے عراق میں سلطنت قائم کی اور بنو عبّاد نکلے جو اشبیلیہ کے مالک بنے۔ غزوہِ مؤتہ میں ایک گروہ نے روم کی طرف سے مسلمانوں پر چڑھائی کی تھی۔ 37ھ میں خلیفہ راشد سیدنا علی بن ابی طالبؓ کے خلاف جنگ میں امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ کی مدد و نصرت کی تھی۔ فلسطین میں آج بھی اس کی شاخیں آباد ہیں۔ ان میں بنو نبھان اور بنو تمیم قابلِ ذکر ہیں۔

ر۔ بنو کلب بن مرہ

یہ قبیلہ دو ہزار سال سے شام، لبنان اور فلسطین میں آباد ہے۔ آج بھی اس کی شاخوں میں بنو عامر زیادہ معروف ہے۔

س۔ جرم بن زیان

یہ جرم بن زیان بن حلوان کی اولاد ہیں جو کہ جنوبی فلسطین میں آباد تھے۔

عرب قبائل کا ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ مسیحی برادری کا ہمیشہ یہ دعویٰ رہا ہے کہ بیت المقدس ان کا علاقہ ہے اور عرب حملہ آور تھے۔ وہ یہاں کے باشندے نہیں ہیں۔ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہاں ہمارا معروف اور قدیم کنیسہ موجود ہے۔ جو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اس بات کی

علامت ہے کہ یہ علاقہ قدیم زمانے سے مسیحی برادری کا ہے اور ان کے آباؤ اجداد یہاں آباد تھے۔

جبکہ اب ہم نے مختصراً چند قبائل کا تذکرہ کیا تا کہ ہم جان سکیں کہ یہ قبائل قدیم زمانے سے یہاں موجود تھے اور یہ سب عرب قبائل ہیں۔ چنانچہ قدامت کا دعویٰ کر کے اگر حق جتانا ہے تو پھر عربوں کا حق بھی اتنا ہی ہے کہ وہ بیت المقدس کے وارث کہلائیں۔

فتح بیت المقدس

جب سیدنا ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے دمشق فتح کیا تو انہوں نے امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کو خط لکھا اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں خلافت کا حکم جاننا چاہا تو خلیفۃ المومنین نے حکم دیا کہ اب اپنی ساری توجہ بیت المقدس کو فتح کرنے پر مبذول کی جائے اور اپنی کوششوں کو وہاں صرف کیا جائے۔ چنانچہ جب ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے امیر المومنین کے اس حکم کو اپنے ساتھیوں تک پہنچایا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ بیت المقدس کی

زیارت کے شوق اور وہاں جا کر عبادت کرنے کی چاہ نے ان کے دلوں کو خوشی سے نہال کر دیا۔

امیر لشکر نے چند مختصر لشکر ترتیب دیے اور ان کے درج ذیل امراء مقرر کیے۔ خالد بن ولیدؓ، یزید بن ابو سفیانؓ، شرجیل بن حسنہؓ، مرقال بن ہاشمؓ، مسیب بن نجبہؓ، قیس بن ھبیرہؓ، عروہ بن مھلھلؓ۔ ان امراء کے ماتحت پانچ پانچ ہزار جانبازوں کا لشکر اکٹھا ہوا اور انہیں ارضِ مقدس کی طرف لشکر کشی کا حکم ہوا۔

جب یہ بیت المقدس کے قریب پہنچے تو لڑائی شروع ہوئی اور دس دن تک یوں ہی لڑائی جاری رہی کہ گیارہویں دن ابو عبیدہ بن الجراحؓ بھی لشکر جرار کے ساتھ آ ملے اور ان تمام مجاہدین نے مل کر تکبیر کے نعروں سے دشمن کے دلوں میں اپنا رعب و دبدبہ ڈال دیا۔

وہاں کے لوگ ایک پادری کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ ایک امیر لشکر اپنے جانبازوں کے ساتھ شہر کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اس پاردی نے انہیں بتایا کہ دیکھو! ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک سیاہ بالوں والا شخص اس شہر کو فتح کرے گا اور اس کا نام عمر ہو گا۔ اگر تو وہ اس شہر کو فتح کرنے آیا ہے تو میں اس

سے صلح کرنا چاہوں گا کیوں کہ صلح کے بغیر چارہ نہیں اور ہمیں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر کوئی اور شخص ہے تو پھر ہم جنگ کریں کیوں کہ اس شہر کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ پادری اور ایک شہزادہ اس کے ساتھ دیکھنے کے لیے آئے جب انہوں نے امیر لشکر ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ عمر نہیں ہیں۔ تو انہوں نے اپنی قوم کو یہ نوید سنائی کہ خوش ہو جاؤ۔ عمر نہیں آئے۔ ہم لڑائی کریں گے اور طویل عرصے تک سخت محاصرہ جاری رہا۔ مسلمانوں نے سخت سردی اور برف باری کے دوران بھی اپنے قدموں کو جمائے رکھا اور جانفشانی کے ساتھ لڑتے رہے۔ پھر ایک دن پادری سے لوگوں نے کہا کہ ان سے جا کر پوچھیں کہ یہ کیا چاہتے ہیں؟ جب وہ لوگ آئے تو انہوں نے کہا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ اگر اس شہر میں داخل ہوں گے اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنیں گے۔

ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے فرمایا کہ ہم اس شہر کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ یہاں سے ہمارے نبیؐ آسمان پر گئے تھے، یہاں انبیاءؑ مدفون ہیں جن کے ہم وارث ہیں۔ پادری نے پھر کہا؛ آپ ہم سے کیا چاہتے ہو؟ ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے

جواب دیا: کہ تمہارے لیے تین راستے ہیں: 1. اسلام قبول کر لو 2. صلح کر لو 3. لڑائی کرو۔

پادری نے دیکھا کہ یہ لڑائی پر مصر ہیں اور ہر گز یہاں سے نہیں ہٹیں گے تو اس نے سر تسلیم خم کر لیا اور شہر حوالے کرنے کا وعدہ کیا مگر شرط لگائی کہ ہم شہر کی چابیاں خود خلیفۃ المومنین کو حوالے کریں گے ورنہ کشت و خون بہے گا اور انسانی جانوں کا ضیاع ہو گا۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے خلیفۃ المومنین کو خط لکھا جس میں ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔

خلیفۃ المومنین حضرت عمر فاروقؓ تشریف لائے اور امن و صلح کے ساتھ شہر کو فتح کر لیا۔ اس شہر کو فتح کرنے کے بعد جو صلح نامہ تحریر کیا گیا اس میں واضح طور پر پادری نے لکھا کہ

"ہم یہ شہر اپنے کنیساؤں، اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے حضرت عمرؓ کے دے رہے ہیں اور اہلِ ایلیاء، اہلِ مدائن کی طرح جزیہ ادا کریں گے"۔

یوں اس پادری نے اقرار کیا کہ "ہم اپنے پاس موجود علم میں یہ بات دیکھتے ہیں کہ سیاہ بالوں والا عمر نامی شخص آئے گا اور اس شہر کو فتح کرے گا اور دوسری

بات یہ ہے کہ اس نے خود تحریر کر کے دیا کہ یہ شہر ہم حضرت عمرؓ کو دے رہے ہیں"۔

ان دو باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس یعنی یروشلم مسلمانوں کی ملکیت ہے اور دستاویزی ثبوت کے ساتھ یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے اور خود ان کی مذہبی کتاب کے مطابق یہ شہر حضرت عمرؓ کے حوالے کرنے کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد موجود تھا۔ چنانچہ اس کے بعد شہر کی ملکیت کے حوالے سے کوئی بحث باقی نہیں رہتی۔

کیا ارض مقدس یہودیوں کی ہے؟

حالیہ اور برسوں سے جاری بحث کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جس طرح یہودی دعویٰ کرتے ہیں کہ ارضِ مقدس ان کی ملکیت ہے اور خدا تعالیٰ نے ان سے اس زمین کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تو اس سوال کے جواب میں مسلمانوں کا مؤقف کیا ہے؟

مسلمانوں کا مؤقف واضح ہے کہ ارضِ مقدس یا بیت المقدس خدا تعالیٰ کی بابرکت جگہ ہے۔ یہ سجدہ گاہ ہے۔ یہاں خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر

اپنی عاجزی و انکساری کا اظہار کیا جاتا ہے ، جہاں سے اس سے مدد و نصرت طلب کی جاتی ہے اور دیگر ضروریات و مصائب کے حل کے لیے پروردگار سے عرض و گزارش کی جاتی ہے لیکن یہودی تو شرک کی نحوست کے ساتھ اس دنیا میں بسنے والی نہایت غلیظ قوم ہے۔ انہوں نے وحدانیت کا درس چھوڑ کر شیطان کا شرکیہ پیغام قبول کیا ہے۔ ان کے اعمال و افعال خالص شیطانی ہدایات کے مطابق روبعمل ہوتے ہیں مگر ان میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے کہ جس سے ثابت ہو سکے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق عمل پیرا ہوں اور دعویٰ کر سکیں کہ یہ ارضِ مقدس اور بیت المقدس ان کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ارضِ مقدس کا جو وعدہ ان سے کیا گیا وہ وعدہ پورا ہو چکا ہے اور یہ خاص حدود و قیود ، وقت اور احکام کے ساتھ مشروط تھا۔ یہ وعدہ موسیٰ کے دور میں اور ان کے متصل بعد حضرت یوشع بن نونؑ اور پھر حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے ادوار میں اور اس کے بعد بھی کچھ جزوی ادوار میں یہ وعدہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے پیغام اور احکامات کا انکار کرتے رہے اور پھر جب اپنی اصلاح کرتے تھے تو خدا تعالیٰ انہیں نواز دیتے تھے اور جب ان کی نادانیاں اور حماقتیں حد سے تجاوز

کرتی تھیں تو اس وقت پھر رب العالمین انہیں سبق سکھاتے اور دنیا بھر میں رسوا کرتے۔ اس استدلال کو سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 4 تا 8 تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ پروردگار نے ان لوگوں سے دو وعدے کیے اور وعدوں کو چند احکامات و ہدایات سے مشروط کر دیا۔ کہا گیا کہ اگر ان ہدایات و احکامات پر عمل پیرا ہو گے تو اللہ تعالیٰ سرخرو رکھیں گے اور جب ان احکامات سے روگردانی کرو گے تو پھر اللہ رب العزت تمھیں ذلت و رسوائی کا مزا چکھائیں گے۔ اور ان کے صحائف میں آگاہ بھی کر دیا کہ تم دو مرتبہ یہ برائی کرو گے اور اللہ تعالیٰ دو مرتبہ تمھیں اس برائی کا عذاب پہنچائیں گے۔ چنانچہ اس بیان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے زمین دینے کا جو وعدہ اس وقت فرمایا تھا وہ پورا ہو چکا اور یہ اس حال اور شرط کے ساتھ مشروط تھا کہ وہ لوگ اطاعتِ خداوندی پر قائم رہیں گے مگر جب انہوں نے من مانیاں شروع کیں اور فرمانبرداری سے منہ موڑا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا بھر میں ذلیل و رسوا کیا۔ سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ بالا آیات میں ان کی تفصیل دیکھ سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں خدا تعالیٰ کی مساجد و عبادت گاہوں سے اپنی نسبت کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جو اس کے پیغام و احکام کی پابندی اور شرائع و ہدایات کی پیروی کرتا ہو مگر یہود نے شرک سے دنیا کو نحوست زدہ کیا، ظلم و بربریت سے انسانیت کی توہین کی ، اجارہ داری قائم کر کے صاحبِ حق کا حق تلف کیا، مفادات کی جنگ میں انسانیت کا خون کیا، معصوم جانوں کے ضیاع کا سبب بنے اور شیطان کے آلہ کار بن کر خدا کے نظام کے سامنے رکاوٹ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوششیں کیں۔ کیا اس کے باوجود یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ مسجد الاقصیٰ اور حرم محترم ہمارا ہے؟ کس منہ سے اپنا حق جتلا رہے ہیں؟

تیسری بات اس ضمن میں یہ ہے کہ یہودی جو دراصل اسرائیلی کہلاتے ہیں اس دنیا میں بہت کم تعداد میں ہیں۔ حتیٰ کہ قیادت کے مناصب پر بھی اسرائیلی یہودی فائز نہیں۔ یہودی قیادت جو ہمیں دنیا بھر میں دکھائی دیتی ہے اور یہودیوں کی کل ابادی کا 80 فیصد حصہ اشکنازی کہلاتی ہے۔ ان کے آباؤ و اجداد خزر سے آئے تھے پھر انہوں نے یہودیت کو قبول کیا۔ قاقوز سے نسبت کی وجہ سے انہیں "کوکیشین" بھی کہتے ہیں۔ یہ نیلی آنکھوں، گوری رنگت اور سنہرے بالوں والے ہیں۔ یہ کسی دور میں بحیرہ خزر کے آس پاس

رہتے تھے۔ انہوں نے گیارہویں، بارہویں ہجری میں یہودیت قبول کی اور پھر آہستہ آہستہ یہودیوں پر تسلط حاصل کرنا شروع کر دیا اور آج حال یہ ہے کہ ہر جگہ یہودیوں میں ان کا تسلط قائم ہے۔ حتیٰ کہ بنی یعقوب جو اصلاً یہودی ہیں وہ بھی ان کے محکوم ہیں اور دیگر یہودی گروہ اور نسلیں مجموعی طور پر کل یہودیوں کا بمشکل 20 فیصد کہلاتی ہیں اور اِن گوری رنگت والے اشکنازی یہودیوں کے محکوم ہیں۔

اس سے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان گورے اشکنازی یہودیوں کا ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں۔ حتیٰ کہ یہ سامی تک نہیں اور خاص طور پر یہودیوں سے سام بن نوح کے بارے میں سوال کرنے کی جرات کوئی نہیں کرتا۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جو لوگ سام کا نام بھی پکارتے ہیں تو انہیں یونیورسٹی سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے یہودیوں کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ سامی نسل کے ٹھیکیدار خود بنے ہوئے ہیں۔ آج بھی اگر یہودیوں کے متعلق کوئی بات کہہ دی جائے تو کہتے ہیں کہ یہ سامی نسل کے خلاف بات کہی گئی ہے حالانکہ ان کا خود سامیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یورپ، پولینڈ، ہنگری سے

آئے ہوئے یہ گوری رنگت والے جو یورپ کے تلچھٹ کے برابر بھی نہیں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بیت المقدس یا ارضِ مقدس ہمارا آبائی وطن ہے۔ اس مطالبے کی کسی سراب سے زیادہ حقیقت نہیں ہے۔

مفتوحہ زمین کے احکام

فقہائے اسلام نے مفتوحہ زمین کے مفصل احکام بیان کیے ہیں۔ ایسی زمین جو فتح یا امن اور معاہدے کے ذریعے حاصل ہو کی گئی ہو۔ ان سب کا حکم یہ ہے کہ یہ دارالسلام کی زمین ہے۔ اس کا دفاع اور حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اس سرزمین پر مسلمان آباد ہوں یا نہ ہوں، مسلمان فتح کر کے آگے بڑھ جائیں یا وہیں سکونت اختیار کریں، اس سرزمین پر مشرکین و کفار قابض ہو جائیں، ہر حال میں یہ زمین مسلمانوں کی کہلائے گی۔ اس کی حفاظت و مدافعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ فقہائے اسلام کے دو اقوال اس تناظر میں پیش کیے جارہے ہیں کہ مفتوحہ زمین کا حکم کیا ہے اور مسلمانوں کے لیے اسلام نے کیا احکامات جاری کیے ہیں؟

امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ "مفتوحہ زمین دارالسلام کہلائے گی چاہے وہاں مسلمان مقیم ہوں یا وہ زمین مشرکین کے حوالے کر دی جائے۔ لیکن یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اس زمین کا مشرکین کو مالک بنانا جائز نہیں ہے۔ (الاحکام السلطانیہ ص136)

مزید فرماتے ہیں کہ "صلح اس شرط کے ساتھ کی جائے گی کہ یہ زمین اور علاقہ مسلمانوں کی ملکیت میں ہو گا۔ اب ایسی مفتوحہ زمین کو بیچنا یا رہن رکھوانا جائز نہیں ہے اور جب یہ سرزمین مشرکین کے حوالے کی جائے گی تو ان خراج وصول کیا جائے گا۔ (نفس المرجع ص137)

ان دو اقوال سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں؛

1. فتح کی گئی زمین ہمیشہ مسلمانوں کی ملکیت کہلائے گی۔ چاہے کفار اس پر دوبارہ قابض ہو جائیں یا وہ زمین مشرکین کے حوالے کر دی جائے۔ ہر حال میں یہ مسلمانوں کی زمین کہلائے گی۔
2. مفتوحہ زمین کا دفاع اور حفاظت مسلمانوں پر واجب ہے۔ یہ کبھی بھی مشرکین کے مِلک میں نہیں جائے گی۔

3. مفتوحہ علاقے کی زمین مشرکین کو بیچنا یا ان کے پاس رہن رکھوانا جائز نہیں ہے۔
4. اگر مشرکین کے حوالے کرنا ہو تو ان سے خراج وصول کیا جائے گا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ زمین مسلمانوں کی ہے۔

لہذا جب یہ باتیں واضح ہو گئی ہیں تو اس سے سرزمین بیت المقدس کے احکامات بھی روز روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے اس زمین اور علاقے کو بزورِ شمشیر یا معاہدے کے ساتھ حاصل کیا ہے تو سب مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ اس پر بعد میں کفار قابض ہوئے تب بھی یہ مسلمانوں کی ملک کہلائے گی۔ اس کا دفاع پوری امت پر واجب ہے۔ جب سیدنا عمر فاروقؓ نے فلسطین کو فتح کیا تھا تو اس وقت یزید بن ابوسفیانؓ کو گورنر مقرر کیا تھا۔ اور وہاں جن کفار کو زمین حوالے کی گئی تھی ان کے حوالے سے سرکاری طور پر خط جاری کیا گیا کہ ان سب سے خراج وصول کیا جائے گا اور جو مسلمانوں کے پاس ہے ان سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔

آزادی بیت المقدس اور ہماری ذمہ داری

بیت المقدس وہ مقام ہے جہاں سرور کائناتؐ نے نماز ادا کی، انبیاءؑ کی جماعت کی امامت کروائی اور وہیں سے عرشِ بریں کا سفر شروع کیا۔ یہ انبیاءؑ کا مسکن اور مرقد ہے۔ یہاں سے توحید و اخلاقیات کا وہ درس جاری ہوا جو آج امت مسلمہ کی میراث ہے۔ چنانچہ اس مقدس مقام کے تحفظ کی ذمہ داری ہر ایک مسلمان پر لازم ہے۔ اس کی حریت و آزادی کی تمنا کرنا، اپنی تمنا کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنا اور اس جدوجہد کی تکمیل کے لیے ہر ممکن اور جائز راستے کا انتخاب کر کے اپنی تحریک و عملی جدوجہد کو جاری رکھنا ضروری ہے۔

عام مسلمانوں کے دل میں ہمیشہ یہ خیال منڈلاتا ہے کہ ہم بیت المقدس کی حریت کے لیے کیا کوشش کر سکتے ہیں ؟ اور اس جدوجہد میں کس طرح شریک ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے چند بنیادی اور اہم باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں تاکہ ہمارے سامنے عملی نوعیت کی وسیع ترین صورت واضح ہو جائے۔

متحدہ اسلامی محاذ کی ضرورت

یہ بات یاد رہے کہ دنیائے کفر و ظلمت کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو متحد ہونا پڑے گا۔ یہ جنگ اسی وقت جیتی جاسکتی ہے جب تمام ممالک متحد ہو کر دنیا کو یہ باور کروائیں کہ مسجد الاقصیٰ کی طرف جو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے گا تو اس کا کام تمام کیا جائے گا یا کم از کم اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑے گا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلم ممالک اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں کوئی مسلم امت کے مفاد کے تحفظ کی بات کرنے کا مجاز بھی نہیں۔ یہ ایک انتہائی صورت حال ہے۔

آپ میری اس بات کا جواب شاید یوں دیں کہ مسلم امت کا ایک اتحاد او آئی سی کے نام سے موجود ہے۔ ہر تین سال کے بعد اس تنظیم کا اجلاس بھی ہوتا ہے تمام مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ اس اجلاس میں شریک ہوتے ہیں، اپنی آراء پیش کرتے ہیں، مسلم امہ کے مفادات کے ایجنڈے پر بات ہوتی ہے اور مسجد الاقصیٰ کے تحفظ و آزادی کا تذکرہ بھی ہمیشہ کیا جاتا ہے۔ مگر میرا سوال یہ ہے کہ او آئی سی نے آج تک اجلاسوں کے سوا کیا کیا ہے؟ آج تک ایک مضبوط موقف کے ساتھ دنیا کے سامنے مسلم امہ کے درد دل کو اس

طرح واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا احساس کفار کو ہوا ہو؟ آج تک کسی عملی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کیا ہے؟ یہ ایک سوئی ہوئی قوم و ملت کا سویا ہوا سربراہی گروہ ہے جو مسلم امہ کے قائدانہ کردار کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ عملاً ہمیں بتاتا ہے کہ مسلم امت کے مفادات کا تحفظ کرنے والے اور اس تحفظ و آزادی کا راگ الاپنے والے کس قدر بے حس و غافل ہیں کہ اپنے وجود کی وجوہ سے ہی مُکر گئے ہیں؟ اپنے مقصد کو بھول بیٹھے ہیں؟ انہیں اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے؟ اپنے وجود اور اس وجود کے اصلی کام کا پلان ان کے پاس موجود نہیں ہے۔

ورنہ دنیا کے سامنے مسلمانوں کے اجماعی موقف کا اظہار اس طرح کیا جاتا کہ دنیا جان جاتی کہ واقعی مسلم امت کے قائدین یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ ہم سے ہمارے ظلم کا حساب مانگیں؟ ہمارے مظالم کا انتقام لیں اور ہمیں اپنی حدود میں واپس دھکیلنے کی کوشش کریں؟

مگر ہم اپنے اجلاسوں کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ ہماری زبانیں بولتی ہیں مگر ہماری تلواریں کند ہیں، ہمارے ہاتھ بڑھتے تو ہیں مگر سامراجی قوتوں کے گھٹنوں کو چھونے کے لیے، ہماری عملی جدوجہد کا کوئی پلان ہمارے پاس نہیں۔

ہماری کاوشوں کا نتیجہ صفر ہے۔ ہمارے جسم کے ٹکڑے ہمارے مومن بھائی، بہنیں، بیٹیاں اور بچے بھوک اور ظلم و بربریت کی چکی تلے پس پس کر جان جانِ آفریں کے سپرد کر رہے ہیں مگر ہم بولنے اور صرف بولنے کے سوا کچھ نہیں کر رہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنی نااہلیوں اور نالائقیوں کی طویل فہرست آپ کے سامنے رکھیں ہم پہلے یہ جانتے ہیں کہ او آئی سی کیا ہے؟ کب وجود میں آئی؟ اس کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ اس کے اہداف کیا ہیں؟ کیا یہ اپنے مقصدِ وجود میں کامیاب ہوئی یا صرف اتحاد نام کا ایک ڈھانچہ ہے جو صرف وجود رکھتا ہے، اثر نہیں۔

21 اگست 1969ء کو ایک یہودی سیاح کے روپ میں مسجد الاقصیٰ میں داخل ہوتا ہے اور مسجد میں پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دیتا ہے۔ یہ آگ زور پکڑ لیتی ہے، مسجد کا چھت اس سے متاثر ہوتا ہے، مسجد کا ایک حصہ اس آگ کی زد میں آکر گر جاتا ہے اور سیدنا صلاح الدین ایوبیؒ کا 800 سالہ قدیم منبر جس پر تشریف فرما کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے وہ بھی بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

اس سازش کے بعد مسلم امہ کے حکمرانوں کو بیدار کرنے کے لیے مفتی اعظم فلسطین آواز بلند کرتے ہیں، مسلم حکمرانوں کی غیرت کو آواز دیتے ہیں اور انہیں ایک ایسے اتحاد اور تنظیم کی دعوت دیتے ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کا تحفظ کر سکے اور خصوصاً بیت المقدس اور مسجد الاقصیٰ کے تحفظ کے لیے پیش قدمی کر سکے۔ مسلمان ممالک اس اتحاد میں شریک ہو کر پوری دنیا کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کریں تب 25 ستمبر 1969ء کو قازقستان کے شہر رباط میں او آئی سی کا قیام عمل میں آتا ہے۔

او آئی سی کے قیام کے مقاصد کے بارے میں او آئی سی کے چارٹر کے آرٹیکل 2 کی ذیلی دفعہ 5 میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ یہ ادارہ مسلمانوں کے اجتماعی تحفظ، فلسطین کی آزادی اور مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔

او آئی سی کے چارٹر کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں بیت المقدس کی آزادی کا واضح تصور دیا گیا ہے۔ وہ تصور دیگر عنوانات کے تحت تفصیل سے بیان ہوا ہے مگر ایک خاص پہلو اس کا یہ ہے کہ او آئی سی کے جنرل سیکرٹری کے دفتر کا مقام یروشلم ہے۔ اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ چونکہ اس وقت اسرائیل نے یروشلم پر قبضہ کر رکھا ہے تو ہم عارضی طور پر اس دفتر کو جدہ میں منتقل رہے

ہیں جیسے ہی بیت المقدس آزاد ہو گا ہم اس دفتر کو یروشلم منتقل کر دیں گے۔ یعنی بیت المقدس کی آزادی او آئی سی کے منشور کا حصہ ہے مگر افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ او آئی سی کی عملی جدوجہد میں فلسطین اور بیت المقدس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ جس کے نام پر او آئی سی کا وجود ہے اسی نام کو بھلا دیا گیا ہے۔

او آئی سی کے منشور میں یہ بات درج ہے کہ فلسطین کی آزادی کے لیے جہاد جاری رہے گا اور وہ معاشی، سفارتی اور عسکری جہاد ہو گا۔ اور یہ افرادی قوت اور ریاستی قوت دونوں کے ساتھ ہو گا۔ مگر آج ہمیں او آئی سی کی کسی طرح کی قوت کہیں نظر نہیں آتی۔ ہم دنیا میں کمی کمین سے بھی زیادہ گرے ہوئے لوگ ہیں۔ طاقت ور جب چاہتے ہیں ہم پر بم برسا کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے واپس چلے جاتے ہیں، اپنے من مانے احکامات دے کر ہم سے ان پر عمل درآمد کا سوال کرتے ہیں۔ یہ دنیا کے سامنے ہماری حیثیت ہے اور یہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں اندھیرے میں رکھنے کے لیے بلند بانگ دعوؤں سے مزین قانون بنا دیا ہے تاکہ ہر مسلمان ان سے امید لگائے بیٹھے اور بالآخر مایوس ہو کر دیوار کے ساتھ لگ جائے۔

ہمیں ان مردہ دلوں والے بے ضرر قسم کے قائدین کی ضرورت نہ تھی۔ امت کو جانباز مجاہدین کی ایک ایسی قیادت درکار ہے جو دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مطالبات تسلیم کروانے کا جذبہ اور ہمت رکھتی ہو، جو دشمن کو اپنی حیثیت باور کروانے کا طریقہ جانتی ہو، جو مسلمانوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کو سبق سکھانا جانتی ہو، جو امت کو سیاسی، عسکری، اخلاقی و روحانی اور افرادی زوال سے بچا کر ترقی اور خوشحالی کی راہ پر ڈالنے کا فن جانتی ہو، جو امت کے نوجوانوں کو بہتر اور روشن مستقبل کی نوید سنائے، جو دشمن کو زیر کرے اور اپنوں کا سر فخر سے بلند کرے۔ مگر ہمیں ان لوگوں سے واسطہ ہے کہ جن سے ہر ایک مومن پریشان اور مایوس ہے، ہمیں بہانہ یہ سنایا جاتا ہے سرحدوں کی تقسیم سے امت کا شیرازہ بکھر چکا ہے مگر کفار انہی سرحدوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے ہم مذہب لوگوں کی امداد کرتے ہیں، انہیں کمک پہنچاتے ہیں، ان کا عسکری اتحاد دنیا کا سب سے بڑا اور مفید اتحاد ہے۔ نیٹو کے نام سے وہ جہاں چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں سبق سکھا سکتے ہیں، دنیا بھر کی افواج ان کا حصہ ہونے پر فخر کرتی ہیں۔ لیکن ہم اپنے بہانوں اور سہاروں سے ہی پیچھے نہیں ہٹ رہے۔ ہم یہ نہیں سوچ رہے کہ امت کے وجود پر سوال

اٹھ رہا ہے۔ ہر پیدا ہونے والا مسلمان مایوسی کی گود میں آنکھ کھولتا ہے اور مایوسی کی قبر میں دفن ہو جاتا ہے۔ اسے کبھی امید کی کرن دکھائی نہیں دی، اسے کبھی آس نہیں دی گئی کہ بہتر ہو جائے گا، اچھا ہو جائے گا۔ اس نے ہمیشہ برا دیکھا، برا سنا اور برائی کو سہتے سہتے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

کب تک زوال کا نشان بنتے رہیں گے؟ کب تک ہم ذلت و رسوائی کا دامن تھامے رکھیں گے؟ کب تک مایوسی کی دلدل میں دھنستے چلے جائیں گے؟ ہماری امید کب بر آئے گی؟ ہماری قیادت کو کب امت کے مفاد کے تحفظ کا احساس ہو گا؟ امت کے وجود کو برقرار رکھنے کا حوصلہ کب پیدا ہو گا؟ کب کفار سے دوبدو ہونے یا اپنے مفادات کے حصول کے لیے ان کے سامنے لب کشائی کا جذبہ آئے گا؟

یہ سارے سوالات صرف ایک مطالبہ کرتے ہیں کہ امت کو ایک مفید و متحرک اتحاد کی ضرورت ہے۔ امت کو زوال سے بچانے اور ترقی کی راہ پر ڈالنے کے لیے، امت کے نوجوان کو مایوسی سے امید دیکھانے اور دنیا میں اسلام کا گرا ہوا مقام واپس دلوانے کے لیے اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔ کاش! ہمارا یہ نوحہ آپ کو جھنجھوڑ سکے اور سوچنے پر مجبور کر سکے۔

اسلامی انقلابی فکر کی آبیاری

دنیا کے کینوس پر جب کوئی قوم زوال کی خاک اپنے چہرے پر مل کر ذلالت کی دلدل میں دھنس جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنی طاقت، وجود اور شعور کھو بیٹھتی ہے۔

طاقت مختلف اقسام و انواع کی ہوتی ہے۔ افرادی و اجتماعی، شخصی و حکومتی۔ بسا اوقات افرادی قوت موجود ہوتی ہے۔ دنیا کے نقشے پر ٹیڑھی میڑھی لائنوں کے ساتھ اس کا وجود بھی ہوتا ہے زمین پر بھی کہیں نا کہیں کچھ حصہ اس کے پاس ہوتا ہے مگر جو اس کے وجود کو "وجود" بخشنے والی طاقت "خودداری" ہے یہ دم توڑ چکی ہوتی ہے۔ ایک طاقت کا نام "وقار" ہے۔ یہ قوموں کا مورال بلند کرتی ہے۔ انہیں کینوس پر خوبصورت رنگ عنایت کرتی ہے۔ دنیا کے سامنے اس کی توقیر کو مزید تقویت دیتی ہے۔

ایک طاقت ہتھیاروں کی بھی ہے۔ مگر یہ اس قدر معنی نہیں رکھتی۔ کیوں کہ دنیا بھر میں کئی قومیں ایسی بھی آئی ہیں جنہوں نے ہتھیاروں کی کمی کے باوجود اپنے لیے کامیابی کے جھنڈے گاڑھے۔ دنیا پر اپنا نام روشن کیا۔ اگر ہم غزوہِ بدر کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے مقابلے پر آنے والے

کفار جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ ان کے پاس گھوڑے ، زرہیں ، تلواریں ، نیزے اور دیگر اشیائے ضروریہ موجود تھیں۔ مگر مسلمانوں کے پاس وافر سواری کوئی نہیں۔ تین تین لوگوں کو ایک سواری میسر ہے۔ کچھ تو پاپیادہ چل رہے ہیں۔ تلواریں بھی چند ایک جن سے کچھ ہی افراد لڑائی کر سکتے تھے۔ مگر نصرتِ الٰہی ان کے ساتھ شامل ہوئی اور جدید اسلحہ رکھنے والے شکست کی کالک اپنے چہرے پر مل کر واپس ہوئے۔ تاریخ کے اوراق ان جیسی بے شمار مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ آج فلسطین میں بھی قابض اسرائیل کے پاس دنیا کا جدید ترین اسلحہ اور دفاعی ٹیکنالوجی پر مبنی ریڈار سسٹم موجود ہے۔ ساری دنیا میں ان کی دفاعی صلاحیت اور جاسوسی مہارت کا شہرہ تھا مگر غزہ میں رہنے والے غیور جوانوں نے اس مہارت اور صلاحیت کو خاک میں ملا دیا۔ اپنے ہاتھوں سے بارود و آئرن کی کمی کے باوجود اس قدر مضبوط اور موثر ترین راکٹس بنائے کہ ان کا ریڈار سسٹم ان کو روکنے میں ناکام رہا۔ وہ مسلسل راکٹ داغ کر اسرائیل کو ناکوں چنے چبوا چکے ہیں۔ لٰہذا ہتھیاروں کی زیادتی کچھ معنی نہیں رکھتی۔

ایک طاقت افرادی قوت کے نام سے بھی ہوتی ہے۔ اس طاقت کا مفید ہونا یا نہ ہونا افرادی وقت کی زیادتی یا فروتنی پر انحصار نہیں کرتا بلکہ افرادی قوت اس وقت موثر ہو سکتی ہے کہ جب وہ ایک مشن اور مقصد کے ساتھ ہو۔ جب محض کرائے کے فوجی لڑائی کرنے کے لیے بھرتی کیے جائیں گے تو پھر وہ کبھی بھی کامیابی کو سینے نہیں لگا سکتے۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقالِ پر ملال کے بعد جب مسلمانوں نے جنگی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور سیدنا صدیقِ اکبرؓ کے احکامات پر عمل درآمد کرتے ہوئے جہادی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا تو اس وقت سیدنا خالد بن ولیدؓ سپہ سالار تھے۔ ایک دن انہوں نے مجلس شوریٰ کے سامنے کے ایک عجیب مطالبہ رکھ دیا۔ مطالبہ یہ تھا کہ ہم ساٹھ ہزار کفار کے مقابلے میں اپنے تیس افراد کے ساتھ حملہ آور ہوں گے۔ یعنی دو ہزار کفار کے مقابلے کے لیے ایک مسلمان کافی ہو گا۔ اور انہوں نے اعلان کیا کہ یہ تیس افراد کی ٹیم ان لوگوں پر مشتمل ہو گی جن کا انتخاب میں خود کروں گا۔ ارکانِ مجلس شوریٰ نہایت پریشان ہوئے اور انہوں نے اس کی اجازت نہ دی اور کہا کہ یہ سراسر خودکشی ہے جبکہ سیدنا خالد بن ولیدؓ اس پر اصرار کرتے رہے۔ پھر اراکین مجلس شوریٰ نے کہا کہ آپ ساٹھ افراد کا انتخاب کیجیے یعنی

ایک ہزار کفار کے مقابلے پر ایک مسلمان ہو۔ انہوں نے اس مطالبے کو تسلیم کیا اور خود ان ساٹھ افراد کو منتخب کر کے اپنے ساتھ کفار کے مقابلے پر لے گئے۔ پوری مسلم فوج ان کے لیے سارا دن دعائیں کرتی رہی اور وہ اسلام کے احیاء کے لئے لڑتے رہے اور لوگوں نے دیکھا کہ شام کو وہ ہی مختصر لشکر صحیح سلامت واپس لوٹ رہا ہے۔ اسی طرح افغانستان کے ساتھ ہوا۔ امریکہ کی جدید اسلحہ سے لیس فوج اور نیٹو افواج بھی ہمراہ تھیں۔ مگر پھر بھی بیس سال مسلسل جنگ کے بعد بھی شکست کھا کر الٹے پاؤں روانہ ہونا پڑا۔ افغانستان میں افراد تھے مگر منظم نہ تھے۔ استحکام تو تھا اسلحہ نہیں تھا۔ ہتھیاروں کی کمی باوجود ایمان کی بدولت استقامت اختیار کی۔

ایک طاقت کو استقامت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اس وقت خصوصاً درکار ہوتی ہے جب زوال قدم چوم رہا ہو، شکست کے آثار نظر آ رہے ہوں، درد آفریں نہ بن سکا ہو، مشکل بس مشکل رہے اس میں لذت و مٹھاس نہ آئی ہو۔ اس وقت استقامت کی اشد ضرورت ہوتی ہے اگر استقامت خامہ فرسائی سے لاتعلق ہو جائے تو پھر قدم لڑکھڑا کر زمین بوس ہو جاتے ہیں، دیو قامتی تار تار ہو جاتی ہے اور فلک شگاف پارسائی مجروح ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات استقامت محض

آنکھیں چرانے سے غائب ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ کوئی اس تاک میں ہو کہ یہ تغافل برتے اور ہم اسے اچک لیں۔ جیسے کوئی گھات لگائے شکاری اپنے شکار کا تعاقب کرتا ہے کہ کسی وقت وہ اس قدر غافل ہو جائے کہ میرا تیر کمان سے نکل کر اس تک پہنچ سکے۔ اتنی سی غفلت شکار کی جان لے لیتی ہے۔ یعنی استقامت محض بیداری کا نام ہے۔ اگر آپ بیدار ہیں آپ کی جماعت اور امت بیدار رہے۔ تو استقامت گویا کہ حاصل ہے ذرا سی اونگ شکاری کو بہترین موقع فراہم کرتی ہے۔ خیر استقامت جس دیومالائی طاقت کا نام ہے وہ جس کو نصیب ہو جائے تو وحدت کے گارے سے اسے اور بھی مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔

وحدت بھی طاقت ہے۔ دیکھیے ہمارے پُرکھ ایک کہاوت بیان کیا کرتے ہیں کہ ایک شخص کے تین بیٹے تھے اور وہ ایک دوسرے سے دور اور کھنچے رہتے تھے۔ ایک دن زمیندار باپ نے فیصلہ کیا کہ آج ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ان کی نسلیں یاد رکھیں گی۔ چنانچہ ایک دن تینوں بیٹوں کو اکٹھا کیا اور انہیں لکڑیوں کا ایک گٹھا توڑنے کو کہا سب نے بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ والد نے اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی کو توڑنے کا کہا۔ سب نے

بآسانی اس گٹھے کو ایک ایک کر توڑ دیا۔ ان پڑھ زمیندار والد نے کہا کہ دیکھو! اگر اسی طرح جدا جدا رہو گے تو جس کا جی چاہے گا تمہیں آسانی سے شکست دے سکے گا۔ لیکن اگر تم ایک گٹھے کی طرح متحد رہے تو کوئی لاکھ کوشش کے باوجود تمہیں توڑ نہیں سکتا۔ قرآن کریم میں چوتھے پارے میں اللہ تعالیٰ نے ایک حکم ارشاد فرمایا "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا" تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقہ مت بنو۔ اگر کوئی جدا جدا جماعت بنا لے، اتحاد کی طاقت سے منہ موڑ کر، جدائی کی ذلت کو سینے سے لگا لے تو قرآن کریم نے اسی کے متعلق تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا "فتذھب ریحکم" تمہارا رعب و جلال ختم ہو جائے گا۔ اتحاد سے جو جلال کسی جماعت کو نصیب ہوتا ہے وہ فراق سے ہوا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اتحاد و اتفاق کی تلقین کی ہے۔ لہٰذا جو اس طاقت سے سبکدوش ہو کر یہ سمجھے کہ میں انقلاب برپا کر دوں گا تو یہ صرف خام خیالی ہے۔

ان سب طاقتوں میں ایک طاقت ایسی ہے وہ جس کو نصیب ہو جائے تو اس سے کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ یہ روح میں گھلنے والی، دل میں بسنے والی اور حرارت بن کر اعمال کی صورت ظاہر ہونے والی طاقت ہے۔ جسے ہم ایمانی

قوت کے نام سے پکارتے ہیں۔ جو قومیں ایمان کا دامن پکڑ کر میدان ِ عمل میں نکلتی ہیں، انقلابی پرچم کو سربلند کر کے فتح کے خواب آنکھوں میں سجاتی ہیں، کلمہء توحید کی اشاعت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا کر جان ہتھیلی پر رکھ کر نعرہ تکبیر کی گونج میں قلعوں کی تسخیر کرنے کا کام کرتی ہیں۔ فتح مبین انہیں کے قدموں کو چومتی ہے۔ انہی کے ماتھے کا جھومر بنتی ہے۔

مختصراً عرض داشت یہ ہے کہ طاقت وہ پہلا رنگ ہے جو دنیا کے کینوس پر کسی قوم کے وجود کو برقرار رکھنے کا سبب ہے۔ جب طاقتیں کم ہونے لگیں یا بے کار ہونے لگیں تو دنیا کے کینوس پر پھیلا ہوا یہ طاقتی رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ دیگر رنگوں کے سامنے مانند پڑ جاتا ہے۔ اس لیے قوموں کے وجود کی ضمانت ان کی طاقتوں کے معیار، بقا اور مسلسل اضافے کی صورت میں ہے۔ اگر یہ حسن فروش ہونے لگے اور دیگر رنگوں کی دسترس بڑھنے لگے تو کہاں وہ رنگت باقی رہتی ہے اور وہ وقار کہاں وجود رکھتا ہے؟ گویا طاقتیں وجود کی ضامن ہوتی ہیں۔

جب طاقت کسی قوم کا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر شعور کی باری آتی ہے۔ یہ شعور دو طرح کا ہوتا ہے۔

شخصی

قومی

شخصی شعور کیا ہوتا ہے؟ یہ درونِ بحث سامنے آتا رہے گا مگر اصل سوال یہ ہے کہ شخصی شعور کا حصول کیسے ممکن ہوتا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ شعور افرادی قوت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ شعور خود حاصل بھی نہیں کیا جاتا یہ آپ کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ یہ پہنچایا جاتا ہے۔ یہ قائدانہ کردار کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو قوم کے راہبروں کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ یہ شعور کسی بھی طرح کا ہو سکتا ہے۔ اس سے منفی و مثبت دونوں طرح کے آثار مرتب ہوتے ہیں مگر کبھی اصل شعور کو ایک قوم سے نکالنے کے لیے ایک نئے شعور کے وجود کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر وہ نیا شعور پہلے سے موجود فکری پربت کو توڑ کر ایک نیا شعوری جبل قائم کرتی ہے کہ جس سے خود قوم کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا شعور مثبت و منفی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔

قومی شعور بھی قائدین کی عطا ہے مگر اس کی بنیاد شخصی شعور پر مبنی ہے۔ اگر قومیں شخصی و قومی شعور میں تفریق کرنے لگیں تو پھر یہ کھوکھلا پن اپنی ذات کا

حصہ بنالیتی ہیں۔ لہذا جب کسی قوم کے فکری و شعوری وجود کے قیام کی بات کی جائے تو یہ لازماً کہا جائے گا کہ پہلے اس کے شخصی شعور کی سطح اتنی بلند کی جائے کہ وہ کج نگاہی کی وجہ سے سراب سے دھوکہ نہ کھالے۔

یہاں ہم نے ان تین بنیادوں کو واضح کر دیا کہ طاقت، وجود اور شعور کسی قوم کے لیے کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔

شعور کی بلندی اور فکری آگہی تقریباً ایک چیز ہے۔ یہاں سے عنوان کو ذرا سا تبدیل کر کے "شعور کو فکر" کہنا شروع کرتے ہیں تاکہ ہمارا مدعا صحیح طور پر سمجھ آسکے۔ فکری آگہی کسی بھی قوم کے لیے نہایت ضروری امر ہے۔ اس کے بغیر وجود اور طاقت دونوں بے معنی ہیں۔ لیکن خالی خولی فکر بھی کافی نہیں ہے۔ اس وقت امت مسلمہ کو اپنی فکر کی تجدید کی اشد ضرورت ہے۔ محض فکر کی تجدید بھی کافی نہیں بلکہ "انقلابی فکر" کی تجدید کی ضرورت ہے۔

اس پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس وقت دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا طاقت اور قوت کا اجتماعی مظاہرہ اور اس کا ادارک ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ ساری دنیا چاہے وہ عسائیت ہو کہ یہودیت۔ پھر ان کے فرقوں کے مابین کتنے فاصلے ہی کیوں نہ ہوں، دوریاں موقف کی ہوں، مزاج کی ہوں، عنوانات کی ہوں یا

سرحدوں کی۔ انہوں نے مجموعی طور پر ان دوریوں کو ختم کر کے ایک ایسے اتحاد کو وجود دیا ہے جو مسلمانوں کے لیے نہایت تکلیف دہ ہے۔ وہ اپنے تمام تر اختلافات کو بھلا کر ایک نکتہ ءوحدت پر جمع ہو گئے ہیں کہ کسی بھی طرح اسلام کے نام لیواؤں کے لیے ترقی کے راستے تنگ کر دیے جائیں۔ چنانچہ وہ ایک نکتہ ءوحدت تلاش کر کے اس پر جمع ہو چکے ہیں۔ اب اگر مسلمان اپنی قوت اور طاقت کے حصول کے بعد اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہیں تو اس سب کے لیے ایک فکری نہج کی ضرورت ہو گی اس فکری نہج سے تقریباً سبھی آگاہ ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کرنے، اختیار کرنے اور علَم بنانے کے لیے کوئی تیار نہیں۔

فکری تجدید کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اس امت میں ہر ایک صدی بعد ایک ایسا شخص پیدا ہو گا جو اس امت کی تجدید کا کام کرے گا۔ اب یہ تجدید کیسے ہوتی ہے؟ اس کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں۔

اسلامی اجتماعی معاشرے کے خدوخال میں جہاں صحیح اسلامی منہاج موجود ہے اور ہمیشہ سے رہا ہے وہیں ایک طرزِ فکر اسلام کے نام پر ایسی وجود میں آجاتی

ہے جو دیگر خس و خاشاک سے مرکب ہوتی ہے۔ اس کا اسلام سے اور اسلامی تعلیمات سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ان کے عقلی و نقلی تاویلات کا ایسا دیوان تراش لیا جاتا ہے کہ جس پر بنیاد رکھ کر نئی تخلیق کردہ عملی و تصوراتی چیزوں کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ بظاہر تو وہ اسلامی تعلیمات کا ایک شعبہ نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا اسلامی تصورات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ ان خس و خاشاک کو دور کرنے کو اور اسلام کو اس کے اصل ماخذ کے لحاظ سے صحیح تعبیری رخ دینے کا کام مجدد کرتا ہے۔ اور یہ تجدیدی کام اسلام کے مسلمہ اور صدیوں سے چلے آنے والے طے شدہ اصولوں کی روشنی میں ہی انجام دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی نیا ضابطہ یا اصول تخلیق نہیں کیا جاتا۔ محض عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی عملی و تصوراتی تعبیر کو واضح کیا جاتا ہے اور یہ اپنی روایت سے منحرف ہو کر نہیں کیا جاتا۔

اس وقت بھی ہمیں جس بحران کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے نام لیواؤں پر عرصہ ء دراز سے زمین تنگ کی جا رہی ہے، عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب ہی کفار کے ہاتھوں سے کشت و خون میں نہا رہے ہیں، قیادت خود ان قاتلوں کے ساتھ ہاتھ ملائے ہوئے ہیں اور وہ لوگ کسی خوف و خطر کو بالائے

طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کی بستیوں کو اجاڑ رہے ہیں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی ایسا قائد نہیں ہے جو ان کفار کو للکار سکے اور مسلمانوں کی حفاظت کا انتظام کر سکے۔ لہٰذا اس وقت پوری مسلم امہ جس بحران کا شکار ہے وہ یہ ہے کہ ایک قائد تک میسر نہیں ہے جو محافظ بن سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ امت وہ راستہ تلاش کرنے سے قاصر ہے جس پر چل کر اپنی بقا کی جنگ لڑی جا سکے۔ گویا ان کی قیادت و سیادت کے ساتھ ساتھ ان کی فکری آگہی بھی ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے انہیں اپنی فکر کی تجدید اور فکری رجحانات کے صحیح منہج کی اشد ضرورت ہے۔

جب اسلام کے نام لیواؤں کو ایک "انقلابی فکر" کی ضرورت ہے۔ تو وہ انقلابی فکر اسلام کے طے شدہ اصولوں کی روشنی میں دیکھیں کہ پہلے ہمارے اکابرین نے اس سخت وقت میں کیا حکمت عملی اختیار کی اور ہمیں اس وقت جس بحران کا سامنا ہے اس میں کون سی حکمتِ عملی کارگر ثابت ہو گی؟

جس نے ان سوالوں کے جواب اکابرین کی تحریکات کی روشنی میں تلاش کر لیے گویا وہ اس انقلابی فکر تک پہنچ گیا جس کی آج ضرورت ہے۔ اب قیادت کا

کام یہ ہے کہ وہ اس انقلابی فکر کی روح کو امت کے ہر فرد تک پہنچا دے۔ گویا اسی کا نام "اسلامی انقلابی فکر کی تجدید" ہے۔

یاس سے آس تک

دنیا میں جن لوگوں کو اقتدار اور قدرت حاصل ہوتی ہے وہ آس اور امید کے خوبصورت دھاگے سے ہمیشہ جڑے رہتے ہیں۔ ان کے دامن میں مایوسی کا تنکا نہیں گرتا۔ لیکن جو لوگ اقتدار اور قوت سے محروم کر دیے جاتے ہیں انہیں یاس و ناامیدی گھیر لیتی ہے۔ انہیں اپنا مستقبل تاریک، حال سنگین اور ماضی حسین دکھائی دیتا ہے۔

کچھ ایسا ہی حال مسلمانوں کا بھی ہے۔ جب خلافت عثمانیہ کا سقوط ہوا، مسلمان بے یار و مددگار ہو گئے۔ علاقے سرحدوں میں تقسیم ہو گئے۔ اب مسلم بھائی چارہ قومیت کی دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ سرحدوں کی باڑ نے امت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ چنانچہ جو جہاں کہیں بھی موجود تھے اپنے تیئں جینے کی کوشش میں مگن رہے اور امت کے دیگر افراد و اشخاص سے بے خبر ہو کر بس زندگی کی ساعتیں گزارنے میں مصروف ہو گئے۔

یہاں امت کا تصور مفقود ہو گیا اور مسلم بھائی چارہ کہیں گمنامی میں چلا گیا۔ چنانچہ ایک ناامیدی کا غیر شعوری خوف دلوں میں پنپنے لگا۔ ایک ایسا خوف کہ جو امت کے تصور کو دھندلا کر دے، جو بھائی چارے کی بنیاد کو کھوکھلا کر دے، جو محبت و اخوت کے شیریں ذائقے میں شک اور بدگمانی کی کڑواہٹ پیدا کر دے۔ چنانچہ ہر ایک فرد اپنے اپنے کنوئیں میں کل کائنات سجا کر بیٹھ گیا اور دوسرے مسلمان بھائیوں سے غیر ارادی طور پر لاتعلق ہو گیا۔

قوموں اور ملتوں کے تصور کو انہی بنیادوں پر بحال کرنے کی ضرورت ہے جو اسلام ہمیں فراہم کرتا ہے۔ وہ تصور خالصتاً دینی و مذہبی ہے۔ جو لوگ کلمہ طیبہ کے اقرار سے اسلام کی خوبصورت چھاؤں میں پناہ لیتے ہیں وہ ایک قوم اور ملت ہیں جبکہ "الکفر ملۃ واحدۃ" کے نظریے کے تحت باقی دنیا ایک سائبان میں کھڑی ہے۔

اس تصور کو دل تو تسلیم کرتے ہیں مگر دماغ انہیں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ "ناامیدی" کا وہ بیج ہے جو ہمارے دلوں میں بویا گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم یاس کے بیج کو آس کے تناور درخت سے تبدیل کر دیں۔ دل و دماغ سے اس تصور کو کھرچ ڈالیں

جو نا امیدی کا سبب بن رہا ہے اور ہر اس فکر کو خوش آمدید کہیں جو آس کی چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔

چنانچہ چند چیزیں ایسی ہیں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ اہم ذمہ داری بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔

1. تبدیلی کا تصور:

سب سے پہلے لوگوں کو یقین دلانا ہو گا کہ یہ دورِ زوال عنقریب ختم ہونے والا ہے اور وہ ذات ہمارے لیے یقیناً بہتر انتخاب کرنے والی ہے۔ اور یہ پروردگار کی سنت ہے کہ وقت بدلتا رہتا ہے۔

"وتلک الایام نداولھا بین الناس"

جس طرح امت اب زوال کا شکار ہے۔ عنقریب وہ دن آئے گا جب زوال کے بادل چھٹ جائیں گے۔

2. امت کی بقا کا تصور:

امت کو یہ یقین دلانا ہے کہ امت محمدیہ واحد امت ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ جس طرح بقیہ امتوں کے ساتھ حشر ہوا یہ امت اس سے محفوظ رہے گی اور اس امت کی بقا خیر و بھلائی کا سبب بنے گی۔

3. حقیقی جنگ سے آشنائی:

قومیت کے تصور نے جنگ کی حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اب جب بھی جنگ ہو گی یا لڑائی ہو گی تو دو قوموں اور ملکوں کے درمیان ہو گی۔ اس سے بڑھ کر بھی یہ تصور عام ہے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔ جبکہ خود پروردگار کا کہنا یہ ہے کہ جنگ تو کفار اور اللّٰہ کے درمیان ہوتی ہے۔ یہودی، عیسائی، مجوسی اور ملحدین دراصل اللہ سے لڑ رہے ہیں۔

دنیا میں یہودی منصوبہ بندی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

انهم یکیدون کیدا واکید کیدا

ویمکرون ویمکر اللّٰہ واللہ خیر الماکرین

مومن لڑائی نہیں کرتے، بم یا گولیاں نہیں برساتے وہ تو اللّٰہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے جو یہ سب کام سرانجام دیتی ہے۔

فلم تقتلوهم ولکن اللہ قتلهم

مومنوں کی ذمہ داری محض اتنی سی ہے وہ میدان چھوڑ کر نہ بھاگیں۔ ثابت قدم رہیں، ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ ان کا دفاع پروردگار کی ذمہ داری ہے۔

ان اللہ یدافع عن الذین آمنوا

4۔امداد و نصرت کی یقین دہانی

حق تعالیٰ کا طریقہ و سنت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ ان کی وہاں سے مدد کرتا ہے جہاں سے مومن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس مدد کا اظہار اور نصرت کی یقین دہانی قرآن کریم میں ان الفاظ میں کروائی گئی ہے۔

انا لننصر رسلنا والذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا و یوم یقوم الاشہاد

دنیا میں تو پرودگار کی معیت و نصرت رہے گی آخرت میں بھی اس کا ساتھ اور انعام مومنین پر برابر ہو گا۔

5. تاریخی حقائق کا ادراک

اسلامی تاریخ میں دو باتیں بہت واضح نظر آتی ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کو قلت و کثرت سے فرق نہیں پڑتا۔ وہ چند افراد پر مشتمل مختصر قافلے بھی بڑے لشکروں کو مات دینے میں کامیاب رہے۔ بدر و مؤتہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی قلت سے قلب و اذہان کو قلق نہیں پہنچنا چاہیے۔

دوسری یہ کہ اسلامی تاریخ میں سقوط ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا۔ جب ایک جگہ اقتدار و اختیار ختم ہوا اور مملکت کا سقوط ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد امت کو ایک نیا وجود بخشا۔ اسلامی تاریخ میں اس کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ سب سے بڑا حادثہ تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی صورت میں تھا۔ مگر اس کے بعد امت کو پورا جزیرہ عرب مل گیا۔ بلکہ اس قدر قوت و طاقت عطا ہوئی کہ کیسر و قصری کے محلات مسلم فاتحین کی سجدہ گاہ بنے۔ بیت المقدس پر صلیبی یلغار بڑھی اور امت اس سے محروم ہوئی تو صلاح الدین ایوبیؒ کی تلوار نیام سے باہر آگئی۔ جب اندلس و غرناطہ کا سقوط ہوا تو خلافتِ عثمانیہ کا وجود ملا۔

چنانچہ ان تاریخی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ امت پر مشکلات اور زوال کی صورت دائمی نہیں ہے۔ ہمیں صرف اپنا رویہ بدلنا ہو گا،

اپنی فکر کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنا ہو گا اور اس انقلابی فکر کی تحریک کو ہر ایک دروازے تک پہنچانا ہو گا تاکہ یہ جو زوال کا اژدھا منہ کھولے کھڑا ہے اسے افرادی قوت سے ایسی مات دی جائے کہ صدیوں یاد رہے۔

6. جدوجہد کا التزام

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جب مؤمن جدوجہد کا آغاز نہیں کرے گا تب تک اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت نہیں آئے گی۔ سونے کا دھات کو قیمتی زیور میں ڈھالنے کے لیے آگ میں جلانا پڑتا ہے اسی طرح مسلم امت پر آئی ہوئی آزمائش میں جب جدوجہد کی آگ سلگے گی تو اس وقت امدادِ خداوندی کا نزول ہو گا۔ اگر مسلم امہ غلامی کو قدرت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لے اور اپنے وجود کی بقا اور تحفظ کا اپنے ہی دشمن کو نگہبان بنا لے تو اس وقت امدادِ خداوندی کا شکوہ اسے جچتا نہیں ہے۔

7. عجلت سے دستبرداری

بحیثیتِ انسان ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہم ہر چیز میں عجلت کے خواں ہیں۔ اگر ہم اپنے زوال کے خاتمے کے لیے کوشاں ہیں تو تھوڑی سی کاوش کے بعد اس کے مثبت نتائج کا شدت سے انتظار ہوتا ہے اگر ہماری توقع کے برعکس

نتائج ملیں تو پھر مایوسی گھیر لیتی ہے۔ اس خامی کو پسِ پشت ڈال کر اپنی کاوش کا سفر جاری رکھنا ہو گا۔ جب اللہ کی مدد و نصرت آئے گی تو فتح مبین حاصل ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ

اگر ان سات گذارشات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم اپنے تصور کو ترتیب دیں اور یاس کے داغ کو اپنے دامن سے کھرچ کر آس کے نور سے تبدیل کریں تو یقیناً امت کے مفاد میں بہتر ہو گا۔